برگ زرد
چکوالی

برگِ زرد

سنہ ۱۹۶۵ء سے سنہ ۱۹۸۱ء تک کے

کلام کا انتخاب

وقت کی ٹہنی پہ ہے اک برگِ زرد

کلپنا نے کیوں کیا دھارن یہ روپ

کیوں فضا میں شام لہرانے لگی

ہے ابھی تو پر پتوں کے سر پہ دھوپ!

طالب چکوالی

طالب چکوالی

بی۔اے (آنرز)، ایل۔ایل۔بی

ترتیب

ناشر :- منوہر پبلیکیشن - جے - ۲/۳ الابیتا نگر ۳۱ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

اشاعت :- اکتوبر ۱۹۸۰ء - طباعت: نعمانی پریس دہلی

قیمت فی جلد - /۱۵ روپے اکتوبر ۱۹۸۰ء

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ ، اُردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳ ، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

منیجر نارتھ لینڈ انڈسٹریز - نئی دہلی ۱۱۰۰۵۵

مقدمہ

(ادیب، نامور شاعر، معتبر جناب سید علی جواد زیدی صاحب کے قلم سے)

طالب چکوالی کا نام کسی دہائیوں سے اردو کے ادبی جرائد میں بار بار آتا ہے اور اُن سے نئی اور پرانی دونوں ہی نسلیں آشنا ہیں۔ پہلے وہ پنجاب کی ادب خیز فضاؤں میں اپنے نغمے بکھیرتے رہے اور اب دلی کی ادبی مرکزیت کو پھر سے زندہ کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ غرض طالب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

اس کے پہلے ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ارباب نظر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا چکے ہیں۔ اب یہ تازہ افکار کا حامل مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں طالب کی شخصیت اور نکھری ہے اور ان کی فکر میں بزرگی کی ٹھہری ہوئی اور سنجیدہ توانائی ابھری ہے۔ وہ بیباک ہو کر سوچتے ہیں اور اُسی بے باکی سے اظہار خیال بھی کرتے ہیں۔ روحانیت اور اخلاقیات کی باتیں ہوں یا حسن و محبت کی، وہ چبا چبا کر باتیں کرنے کے عادی نہیں ہیں جو سادگی اُن کی زندگی میں ہے وہی اُن کے اشعار میں بھی نمایاں ہے۔

وہ شاعر ہی کیا جس میں انا نہ ہو، لیکن وہ کبھی اس کی بے جا نمائش نہیں کرتے۔ وہ کم سخنی کا مجسمہ ہیں اور ان کی آنکھوں کے حسین گوشے ہر وقت مسکراتے ہی رہتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے شعروں میں بھی ہے۔ ایک دھیما سرور اور جذبات کو بڑے ضبط سے اور دبی آواز میں کہنے کا انداز انھوں نے اپنایا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی پیغام آشکارا ہو کر واعظانہ رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن عام طور سے وہ ان مواقع پر بھی استفہام

یا ہلکے طنز سے کام لیتے ہیں۔ واعظانہ لہجہ اختیار کرتے وقت بھی وہ خطیبانہ طمطراق اور جوش و خروش سے کتراتے ہیں۔ اُن کے یہاں انحراف کی جرأت بھی ہے لیکن وہ روایت سے بہت دور جانے کو تیار نہیں ہوتے، اُن کی روایت پرستی بس محتاط جرأت کو گوارا کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ؎

ہو ضرورت نہ جس کو بندوں کی — کوئی ایسا خدا نہیں ہوتا
اُس کا کوئی خدا نہیں بنتا — جس کا کوئی خدا نہیں ہوتا

یہ مساوات کا زمانہ ہے — چڑھ گیا سب پہ رنگ حرص و آز

آئی تہذیب خداؤں کا سہارا لے کر — تھی عقیدت بھی روایت کے طرفداروں میں
کفر کی آگ کو ایمان بجھاتا ہی رہا — اور شامل بھی رہا شر کے پرستاروں میں

خود فریبی ہے کہ اغیار کی سازش غالب — دیش دشمن بھی ہیں اب قوم کے معماروں میں
تھے مرے قتل کی سازش کے محرک جو لوگ — سب سے آگے ہیں وہی میرے عزاداروں میں

مانگے کا لباسِ نو بے کار ہوا ثابت — کام آئی تو اپنی ہی دیرینہ قبا آئی

زندہ بشکلِ نو رہیں اقدارِ دائمی — نقشِ جدید عکسِ خیالِ کہن رہا

اس دلِ ناکام کو ناکام ہونا چاہیے — سادہ لوحی کا یہی انجام ہونا چاہیے

مقدر میں ہوتا تو سانچے میں ڈھلتے، یوں ہی جل نہ جاتے پگھلتے پگھلتے
اصولوں سے بروقت کنارا، نہ بنتی اگر بات پہلو بدلتے

لاکھوں کی بھیڑ میں بھی ہوں سب سے الگ تھلگ
اس شہر میں غریب کا غم خوار ہے کہاں؟

جب وہ حسن و عشق کی باتیں کرتے ہیں تو انداز کچھ یہ ہوتا ہے

خاموش محبت کے تغافل کی الگ بات۔ مخمور نگاہوں میں شرارت کی ادا اور

بات بنتی نہیں بگڑنے سے ہم نے دیکھا انھیں خفا کر کے
کچھ بھی کہا نہ اس نے سنگدل کو کیا کروں

پہروں یہ اپنے آپ سے محو سخن رہا
جھکے ہوئے گلاب ہیں جلتے ہوئے کنول

جلوے چھلک پڑے ہیں کسی کے ایاغ سے
حسن کا رعب احساس پہ چھا گیا میں یہ سمجھا مرے گھر خدا آ گیا!

طالب کی غزلیں عصری مسائل کے لطیف اشاروں سے بھری پڑی ہیں لیکن تفصیلی اقتباسات کی گنجائش نہیں، وہ پرانی قدروں کی شکست و ریخت کا افسوس تو کرتے ہیں، لیکن اسی لئے کرتے ہیں کہ ان کی جگہ مناسب قدریں ابھر نہیں رہی ہیں اور مفاداتِ خصوصی اور حرص و ہوس، زر پرستی اور دنیاداری، انکا روگردار کو تباہ کئے جا رہے ہیں۔ یہ ناآسودگی ہی اُن کے فن کی زندگی ہے اور وہ اسی سے بہت سے چبھتے ہوئے اشعار نکال لیتے ہیں۔

نظمیں تو مسائل حاضرہ پر لکھی ہی گئی ہیں۔ انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں لیکن نظموں کا انداز توضیحی ہے۔ یہاں وہ صاف لفظوں میں داستان سُنانے اور استعارات و کنایات سے دامن بچانے کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ طرز حالی اور آزاد کے زمانے سے اردو نظموں کا ہر دل عزیز اسلوب رہی ہے۔

جدید اسالیب بیان اسی سے کترا کے نکلتے ہیں۔ انھوں نے نئے نئے آہنگ پیدا کرتے ہیں لیکن طالب اپنی نظموں میں روایت کی لکیر سے کم ہی آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی وہ وقت کا دریا جیسی نظمیں طرزِ اظہار کے زیادہ تازہ نمونے پیش کرتی ہیں۔

کچھ نظمیں شخصیات پر ہیں۔ ان کا انداز جذباتی مگر پُر خلوص ہے اور یہی خلوص اُن کا جواز ہے۔ یہی حال "ایکتا" کی طرح کے موضوعات کا بھی۔ کچھ موضوع ہوتے ہی ایسے ہیں جن کا جذباتی غلو شعر پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جتنا ہی شعر جذباتی ہوگا اُسی حد تک فکری گہرائی کم ہوتی جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی نوعیت ذاتی مرثیوں کے علاوہ کچھ اور نہ ہوتی اور اب بھی اس آہنگ سے چھٹکارا نہیں مل پا رہا ہے۔ پھر بھی اگر ان موضوعات پر بھی لکھتے وقت تخئیلی آہنگ کی آمیزش بھی کر لی جاتی تو فکری عمق کی کمی محسوس نہ ہو پاتی۔

یہ مجموعہ خوش فکری اور خوش مذاقی کا آئینہ دار ہے۔ حسنِ گویائی اور قوتِ اظہار پر کہنہ مشقی کی مہر ہے، اور طہارتِ فکر ان کی روایت پسندی کا ورثہ ہے۔ پھر بھی جا بجا وہ بڑی جرأتِ اظہار سے کام لیتے ہیں۔ وہ جرأت جو صرف اُس ثقافتی اور روحانی پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے جس کی آغوش میں طالب نے آنکھیں کھولی ہیں۔ زبان ہلکی پھلکی لکھتے ہیں لیکن جہاں ضرورت پڑتی ہے وہاں وہ ایسی زبان بھی آزادانہ استعمال کرتے ہیں جو اُن کی فکر اور جذبے کا بوجھ اُٹھا سکے۔ اُنھوں نے قدیم اور جدید کے مابین ایک متوازن رویہ اپنایا ہے اور اس لئے اُمید کی جا سکتی ہے کہ ان کا مجموعہ دونوں ہی حلقوں کی توجہ جذب کرے گا۔

علی جواد زیدی

حامد لاج۔ امیر نشاں
علی گڑھ۔ ۱۰ر جنوری سنہ ۱۹۸۰ء

پیش لفظ

(عالی جناب پنڈت آنند نارائن ملاّ صاحب ایم۔اے ایل ایل۔بی،
ریٹائرڈ جج الہ آباد ہائیکورٹ۔ صدر کل ہند انجمن ترقی اردو۔ نئی دہلی)

طاؔلب صاحب مجھ سے سال یا ڈیڑھ سال بڑے ہیں۔ اور اس طرح صحیح مفہوم میں میرے ہم عصر بھی ہیں اور ہم سفر بھی۔ بیسویں صدی کا آغاز اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیتا ہے اور اقبال اور چکبست شاعری کو ایک نیا لہجہ بھی دیتے ہیں اور ایک نئی وسعت بھی۔ یہ دونوں دردِ دل کا تنگ دائرہ چھوڑ کر دردِ وطن اور دردِ انسان کی فضا میں خالی خود ہی نغمہ پیرائی نہیں کرتے، بلکہ نئی نسل کو اپنا ہم نوا بناتے ہیں اور اس نئے ادبی کارواں میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ طاؔلب کا شمار ان شعراء میں ہے جو پرانی قدروں سے بغیر انحراف کئے اس نئے کارواں میں شریک ہیں۔ شاید ان کو اس کارواں کے بڑے رہنماؤں میں جگہ نہ دی جا سکے، لیکن ان کا مقام ان رہ نماؤں کے پیچھے اور بالغ نظر رفیقوں میں ضرور ہے، جنھوں نے اردو شاعری کو آج کے دور تک پہونچایا اور اسے ایک نیا مزاج پانے میں نمایاں مدد دی۔

دستخط آنند نارائن ملاّ

۳۱ر مئی سنہ ۱۹۸۰ء

آخری پتّہ

لو مَیں نے آخری پتّہ بھی کھیل دیا۔ اَب میرے ہاتھ میں کوئی پتّہ باقی نہیں، اب کھیل میں میری دلچسپی اسی حد تک رہ گئی ہے کہ دوسروں کو کھیلتے دیکھوں۔ جن کے ہاتھوں میں ابھی پتّے باقی ہیں، وہ کون سا پتّہ کھیلتے ہیں کیا وہ میرے پتّے کی کاٹ تو نہیں، بہرحال کھیل میں ابھی میری دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ تھوڑی سہی لیکن باقی ہے۔

ایک شاخِ خزاں دیدہ پر اُس کا اکلوتا پتّہ اُس سے چپکا ہُوا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہے، سونے جیسا زرد، پیلا کنچن، لیکن وہ ابھی خشک نہیں ہُوا۔ اس میں ابھی تازگی ہے، لچک ہے، تھوڑی بہت بلکہ کافی جان باقی ہے۔ دیکھیں کب تک ہوا کے جھونکے اُسے گوارا کرتے ہیں۔ کب تک وہ اپنی تنہا شخصیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ ایک دن وہ شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر آ گرے گا۔ کوئی بچہ اُٹھا کر اس سے کھیلنے لگے گا۔ کوئی بڑا دیکھے گا تو پکار اُٹھے گا:

"پیلا پتّہ بھی کوئی کھیلنے کی چیز ہے؟ پھینکو اسے۔"

اگر بچّہ گُڈ بوائے (Good Boy) ہوگا تو پتّہ پھینک دے گا۔ لیکن سبھی بچّے گُڈ بوائے نہیں ہوتے!

طالب چکوالی

سوال

جانے کتنی بار میرے دِل میں اُٹھا یہ سوال
کیا یہ لازم ہے کہ "شاعر" شعر کہتا ہی رہے؟
کیا یہ لازم ہے دکھاتا ہی رہے سینے کے داغ؟
کم نظر کی داد یا بے داد سہتا ہی رہے؟

تا دمِ آخر سُناتا ہی رہے رودادِ غم؟
گہ غمِ جاناں کے قصّے گہ غمِ دوراں کی بات!
عمر بھر کرتا رہے افشا رموزِ زندگی؟
زیست کی تاریکیوں میں چشمۂ حیواں کی بات!

نزع کے عالم میں بھی کہتا رہے اشعارِ تر؟
گیت گاتا ہی رہے حُسن و جمالِ یار کے!
برق پا لمحات کو دیتا رہے عمرِ دوام؟
ہائے وہ لمحے جنہیں کہتے ہیں لمحے پیار کے!

ہم نے مانا وہ غمِ آفاق کا ناسُور ہے
کیا یہ لازم ہے کہ یہ ناسُور بہتا ہی رہے؟
جاں بلب ہونے پہ بھی دیتا رہے پیغامِ زیست؟
کچھ نہ کہہ سکنے کی حالت میں بھی کہتا ہی رہے؟

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

غدّار

سب سے بڑے دشمن سے بھی غدّار بُرا ہے
چنگیز و ہلاکو سے یہ مکّار بُرا ہے
اغیار کا یہ حربۂ خونخوار بُرا ہے
شیطان سے شیطان کا ہتھیار بُرا ہے!

اے قوم تری گود میں پلتا ہے قصائی
اپنوں کا لہو بیچ کے کرتا ہے کمائی
منظور اسے قوم و وطن کی ہے بُرائی
یہ دیش کے دشمن کا وفادار بُرا ہے!

صیّاد پہ کرتا ہے عیاں راز چمن کے
دشمن کو دکھاتا ہے نشاں سرو سمن کے
اغیار کو اسرار بتاتا ہے وطن کے
اغیار کا یہ حاشیہ بردار بُرا ہے!

لاتا ہے عدو کے لئے فائل یہ چُرا کر
آپس میں لڑاتا ہے برادر سے برادر
بنتا ہے یہ واعظ کبھی لیڈر کبھی دلبر
مخبر کا کوئی سا بھی ہو کردار بُرا ہے

خود داریٔ تہذیب کہن بیچنے والا
بہبودیٔ گلہائے چمن بیچنے والا
آزادیٔ ابنائے وطن بیچنے والا
عیّار، دغا باز، ریاکار بُرا ہے
دشمن سے کہیں دیش کا غدّار بُرا ہے

ایکتا

وطن ہندوستاں ہے اور ہم ہندوستانی ہیں
شرافت کا نمونہ ہیں مروّت کی نشانی ہیں

ہمیں جور و تشدّد کے پرستاروں سے نفرت ہے
ہماری فطرتِ عالی محبّت سے عبارت ہے

ہمیں چنگ و رباب و دلربا سے بھی محبّت ہے
ہمیں تیر و تبر تیغ و سناں سے بھی عقیدت ہے

ہمیں سے بزم کی رونق ہمیں سے بزم آرائی
ہمیں سے عرصۂ جنگ و جدل میں شانِ زیبائی

شجاعت کو نیا اعزاز بخشا ہے "جوانوں" نے
لگا دی جان کی بازی وطن کے پاسبانوں نے

ہماری وِیرتا سے رہ گئے ششدر جہاں والے
ہماری ایکتا نے فکر کے دھارے بدل ڈالے

ہمیں اس ایکتا کو، کچھ بھی ہو ملحوظ رکھنا ہے
بہر صورت بہر قیمت اسے محفوظ رکھنا ہے

نئی دہلی
۲ر نومبر ۱۹۶۵ء

زندگی اور موت

پیچھے پیچھے زار[1] صاحب کے تشرر[2] بھی چل دیئے

جانے پہچانے سخنور ہم سے رخصت ہو گئے

موڑ کر منہ جا رہے ہیں جیسے ہوں نا آشنا

زینت محفل تھے جو شیدائے خلوت ہو گئے!

کیا خبر محفل وہاں بھی ہو کوئی احباب کی

جو بھی جاتا ہے نہیں آتا وہاں سے لوٹ کر

بھول جاتے ہیں کسی کو یاد تک کرتے نہیں

ہم ہیں اُن سے بے خبر اور وہ ہیں ہم سے بے خبر

کیا خبر خلوت جسے سمجھے ہیں ہم خلوت نہ ہو

کیا خبر ہو "مستقل" سمجھے ہیں جس کو "مستعار"!

کیا خبر اک چیز کے دو نام ہوں "مرگ و حیات"

کیا خبر ہو زندگی ہی موت کی آئینہ دار!

ہم بھی طالب زندگی اور موت کے چکّر میں ہیں

ہم کو بھی مرغوب ہے خوشنودیٔ مرگ و حیات

رہے ہیں اس سے محبت اور اُس کا انتظار

بادۂ گل رنگ ہے یہ اور وہ شاخِ نبات!

[1] حضرت زار دہلوی (شاگرد حضرت داغ دہلوی) [2] حضرت [illegible] تاریخ وفات ۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء ... تاریخ وفات ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء

مجبوری

بہت جی چاہتا ہے ہر کسی سے پیار کرنے کو
مگر ایسی کہاں قسمت کہ دل مجھ کو ڈراتا ہے

کئی بے رنگ سے خاکے کئی صد رنگ تصویریں
خدا معلوم کن تاریکیوں سے کھینچ لاتا ہے

سناتا ہے کبھی بیتی ہوئی باتوں کی شہنائی
کبھی ماضی کے البم سے مجھے فوٹو دکھاتا ہے

جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں وہ حسیں چہرے
زبردستی دکھاتا اور مجھ پر مسکراتا ہے

"انہیں کیا جانتے ہو تم، انہیں پہچانتے ہو تم"
ادائے طنز سے ہر ایک پر انگلی اٹھاتا ہے

"یہی تو ہیں وہ جن کے رات دن تم گیت گاتے تھے
یہی تو ہیں وہ جن پہ پیار اب بھی تم کو آتا ہے"

میں کہتا ہوں خدا کے واسطے خاموش ہو جاؤ
ستانے میں کسی مجبور کو کیا لطف آتا ہے؟

مری مجبوریاں کافی نہیں کیا منہ چڑانے کو
جو تو بھی منہ چڑاتا اور میری جان کھاتا ہے

جسے میں چاہتا ہوں پیار کر سکتا نہیں اس سے
میں جس سے پیار کرتا ہوں وہ مجھ سے روٹھ جاتا ہے

(تماہی "ہما" لکھنو)

آہ! حضرت محروم

تاریخ رحلت ۶ جنوری ۱۹۶۶ء مقام نئی دہلی

اُٹھ گیا بزم سے وہ پیرِ مغانِ اُردو
ختم اک دور ہوا حضرتِ محروم کے ساتھ

شاہ اقلیمِ سخن آپ رہے تا بہ حیات
خدمتِ علم و ادب کی ہے بڑی دھوم کے ساتھ

فیضِ محروم سے محروم ہوئی ہے اُردو
ظلم اک اور ہوا بے کس و مظلوم کے ساتھ!

پہلے پنڈی[1] میں رہا ساتھ اور اب دِلّی میں
ہم کئی سال سے وابستہ تھے مرحوم کے ساتھ

غمِ محروم کا ہو جائے مداوا شاید
صبر ہے محوِ تکلّم دلِ مغموم کے ساتھ

(تعزیتی جلسہ کانسٹی ٹیوشن کلب میں پڑھی گئی)

[1] راولپنڈی "ریفارمر" دہلی

شری لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہند

(نے ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں رحلت فرمائی)

اے بہادر لال اے بھارت سپوت ٠ تو تھا امن و آشتی کا پاسدار
امن کی خاطر گیا تھا تاشقند ٠ تو نے کر دی جان بھی اس پر نثار

امن و صلح و جنگ میں یکتا تھا تو ٠ بھارتی تہذیب کا آئینہ دار
پیکرِ عجز و خلوص و سادگی ٠ تو تھا تہذیب و تمدن کا نکھار

تو نے یک جہتی عطا کی قوم کو ٠ ایکتا کا دان بھارت کو دیا
سر ہوا اونچا ہمارا ہر جگہ ٠ تو نے وہ سنمان بھارت کو دیا!

عزم تیرا آہنی دیوار تھا ٠ سالمیت ملک کی تھی تیری جان
شانِ ملک و قوم تھی پیشِ نظر ٠ تجھ کو اپنی جان سے بڑھ کر تھی آن

ہو گئی گُل شمع دے کر روشنی ٠ جنگ کی کالی گھٹائیں چھٹ گئیں
ہو گئی نفرت کی فوجوں کو شکست ٠ طاقتیں امن و اماں کی ڈٹ گئیں

زندگی کے ساتھ وابستہ ہے موت ٠ یہ حقیقت ہے مگر کتنی عجیب!
ہم کو یہ احساس ہوتا ہی نہیں ٠ زندگی سے موت ہے اتنی قریب!

ظلمتِ شب سے سحر کی دلکشی ٠ یاس سے امید کا روشن ہے نام
موت کے روکے کبھی رک سکتا نہیں ٠ زندگی کا کاروانِ تیز گام

ہند ہے اس قافلے کا رہنما ٠ کارواں سالار، میر کارواں
امن عالم کا علم بردار ہے ٠ امن پرور، صلح جو ہندوستاں!

اُمّیدِ بقا

(حضرت مُنوّر لکھنوی کے عزیز گُل دیپا کو گود لینے کی تقریب پر)

اُمیدِ بقا کے سہارے بشر نے
غمِ زندگی کو سنبھالا ہُوا ہے

چمن در چمن ہے ریاضِ مسرت
ہر اک پھول خوشیوں کا پالا ہُوا ہے

مُنوّر کی دُنیا ہوئی نُور ساماں
کہ نُورِ نظر سے اُجالا ہُوا ہے

یہ تقدیر کی کارفرمائیاں ہیں
کہ تدبیر کا بول بالا ہُوا ہے!

مقدّر کو بھی تو بناتا ہے کوئی
مقدّر بھی سانچے میں ڈھالا ہُوا ہے

ملا ہے مُنوّر کو گُل دیپ طالب
دیال اُس پہ وہ دینے والا ہُوا ہے

ہمیشہ دیال اُس پہ کرتا رہو گا
مُنوّر کا گلزار گُل بار ہو گا

نینی تال کا بلاوا

میرے لئے کھلا ہے درِ نینی تال پھر
بختِ رسا نے کر دیا مجھ کو نہال پھر

کھلنے لگے ہیں پھول تصور کے باغ میں
معمورۂ حیات ہے جنت مثال پھر

آنے لگے ہیں یاد فراغت کے مشغلے
چھائے ہیں ذہن و قلب پہ حسن و جمال پھر

پیشِ نظر ہیں شاہدِ فطرت کی شوخیاں
آنکھوں کے سامنے ہیں وہی خد و خال پھر

کہسار کی فضا میں ہے رنگینیٔ بہار
فردوس کا جواب ہیں دشت و جبال پھر

کیفیتِ نشاط نے مجھ کو بچا لیا
بے کار ہو گئی ہے زمانے کی چال پھر

تخئیل کی نظر ہے کہ قوس قزح کے رنگ
حسنِ بیاں کا روپ ہے حسنِ خیال پھر

آئینۂ جمال ہے فطرت کا رنگ روپ
چمکے گا اس کے فیض سے میرا کمال پھر

ہر اجنبی سے پہلے بناؤں گا دوستی
احبابِ بے نیاز کا پوچھوں گا حال پھر

کھو جاؤں گا میں جنتِ راز و نیاز میں
ہو گی سکونِ دل کے لئے دیکھ بھال پھر

دنیائے کش مکش سے ہو اب بے نیاز دل
باغ و بہار بن گئے خواب و خیال پھر

وہ حسن کا لمحہ لمحہ تھا پیغامِ انبساط
اللہ لوٹ آئے ہیں وہ ماہ و سال پھر

دیرینہ اشتیاق و امیدِ حیاتِ نو
بُننے لگے حسین فریبوں کے جال پھر

طالب کسی کے لطف و محبت سے ہو گیا
میرا جہانِ شوق و تمنا بحال پھر

(”ملاپ“ نئی دہلی)

جنم دن (خود اعتمادی)

جنم دن آج ہے بطالب تمہارا — چھیاسٹھ سال کے تم ہو گئے ہو
جسے دیکھا چھیاسٹھ بار تم نے — اُسی کی دل کشی میں کھو گئے ہو!

جہانِ رنگ و بُو سے تم ہو واقف — جہانِ رنگ و بُو کے راز داں ہو
رموزِ زندگی تم پر عیاں ہیں — رموزِ زندگی کے ترجماں ہو!

بہارِ زندگی جی بھر کے دیکھی — خزاں کے خوف سے کیوں مر رہے ہو؟
خزاں کا حُسن بھی تو دیدنی ہے — اک انجانے حسیں سے ڈر رہے ہو!

سمجھتے ہو جسے نا آشنا تم — یہ ممکن ہے تمہارا آشنا ہو!
تراشا ہے تمہارے ذہن نے جو — تعجب کیا جو وہ بُت ہی خدا ہو!

ہے ڈر تخلیق ذہنِ منتشر کی — ہوائی بھوت ہیں خدشاتِ انساں
ڈراتے ہیں اسے نادیدہ حالات — ہے انجانے کا ڈر غولِ بیاباں

ہے بنیادِ یقین کمزور جن کی — بہت مشکوک مستقبل ہے اُن کا
بہاریں اُن کی مرہونِ خزاں ہیں — خوشی میں بھی ہے اُن کو غم کا دھڑکا

خدا پر ہے نہ خود پر ہے بھروسہ — مرے جاتے ہیں خوفِ نکتہ چیں سے
بشر کی شان ہے خود اعتمادی — جِلا پاتی ہے یہ علم و یقیں سے

یقیں کی دے مجھے دولت خدایا — سکونِ دل کا سرمایہ عطا کر
مرا ہر کام ہو تیرے ہی ارپن — عطا مجھ کو دلِ بے مدعا کر

مرے رہبر! مجھے ذوقِ سفر دے — بہ آسانی کٹے دورِ عبوری
کشش منزل کی کھینچے جا رہی ہے — ہوئی خواب [illegible] منزل کی دوری!

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

نذرِ عقیدت

(حضرت محروم مرحوم کی ۸۰ ویں سالگرہ کے جلسے میں جو ۳۰ جولائی ۱۹۶۶ء کو دِلّی پبلک لائبریری دلی میں منعقد ہوا - پڑھی گئی)

ہزاروں کا جنم دن تھا یہی دن — مگر اُن میں سے نکلا ایک محروم
بڑا ہو کر بڑا شاعر بنا جو — مچی ہے جس کے علم و فضل کی دھوم

خدا کی شان پتھریلی زمیں میں — مہک اُٹھا، گُلِ گلزارِ اُردو
کہاں "سرحد" کہاں "دِلّی کی گلیاں!" — کہاں پیدا ہوا غمخوارِ اُردو

خدا نے دی اُسے خود اعتمادی — بنے عزم و عمل اُس کے سہارے
بڑی محنت سے کی تکمیلِ تعلیم — کئی بگڑے ہوئے نقشے سنوارے

نظر گہری تھی مثلِ بحرِ قلزم — تخیّل میں ہمالہ کی بلندی
دلِ مغموم میں انساں کا درد — جوازِ غم نوازی، غم پسندی!

طبیعت میں غضب کی سادگی تھی — فرشتوں سے سوا دل کی صفائی
نہ بن بن کر بگڑنے کا سلیقہ — نہ خود بینی، نہ ذوقِ خودنمائی

حسین ذوقِ نظر ذوقِ بیاں سے — نوا سنجی نثارِ نکتہ دانی
ہے گنجینہ ہدایت کا ہر اک لفظ — ہے ہر اک شعر میں "گنجِ معانی"

بڑا شاعر بھی ہو انسان بھی ہو — کہاں ہر ایک کی ایسی طبیعت
حضورِ عظمتِ کردارِ محروم — جھکا جاتا ہے سر بہرِ عقیدت

فتحِ جہات

(ڈاکٹر شمبھو ناتھ صاحب کی ہندی کوتا "دِگ وجے" کا

(اُردو ترجمہ برائے آل انڈیا ریڈیو)

ابرِ رواں آغوش میں بھر لو، ناممکن کو ممکن کر لو!

بجلیوں کو اعضا پہ لپیٹو! فاصلوں کو پاؤں میں سمیٹو!

بھر دو نقوشِ پا سے فلک کو اور رَن بیر منو کے بیٹو!

قوسِ قزح شانوں پہ دھر لو، ناممکن کو ممکن کر لو!

گھر ہے خلا تو پھر سے ڈر کیا پست و بلند اور خشک و تر کیا!

جب اطراف بسے سانسوں میں پھر "اندر" کیا اور "باہر" کیا!

زینۂ انجم چڑھ لو اُتر لو، ناممکن کو ممکن کر لو!

گرم و سرد کا جھگڑا چھوڑو رہ تکتی ہے قضا نکلنے دو

بھر لو شیشے کی نلیوں میں سرگرداں آوارہ من کو!

بحرِ خلا سے پار اُتر لو، ناممکن کو ممکن کر لو!

بیتے لمحے رہ گئے پیچھے پُل تھے جو بھی حدوں کے ٹوٹے

نیچے شکستہ محرابوں کے دیکھو مٹتے جھوٹے سپنے

سادہ کرنوں سے ہی سنور لو، ناممکن کو ممکن کر لو!

شیر دلو! انسان کے بیٹو! دھرتی کے بھگوان کے بیٹو!
جوشِ عمل سے، ذوقِ سفر سے عزم و یقیں کی تیغ و تبر سے
شش اطراف پہ قبضہ کر لو انبر، امبر، شمس و قمر لو
جا کے خلا میں ناچو کودو نادیدہ افلاک کو چھو لو
ہمت کے اوتار انسانو! جیون جوتی کے پروانو!

سعیٔ عمل سے جیون بھر لو!
ناممکن کو ممکن کر لو!
ناممکن کو ممکن کر لو!

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

احسان

کیسے کہوں کہ مجھ پہ اب احسان نہ کیجئے
کلمہ زباں پہ شکر کا لایا نہ جائے گا
اتنا دبا ہوا ہوں تہہِ بارِ التفات
احسان اور مجھ سے اٹھایا نہ جائے گا

۷ جولائی ۱۹۶۹ء (طالب چکوالی)

وقت (دبلیننگ ڈرس)

وقت آئے گا کہ تجھ سے بھاگ جائیں گے وہ سب
ہاں وہ سب سمجھے ہوئے ہے جن کو تو اپنا عزیز
فالتو پیسہ کس کے پاس؟ کس کے پاس وقت؟
کیوں سُنے کوئی بھلا ماضی کا بے ہنگم الاپ!

وقت آئے گا کہ تیرے پاس ہو گا وقت ہی
اور بجز اُس کے نہ ہو گا کوئی بھی تیرا رفیق
اُس کا وہ معصوم بچپن، اُس کا وہ ظالم شباب
بن کے تصویریں دلِ ناکام کو بہلائیں گے

وقت آئے گا کہ تجھ سے وقت بھی جائیگا رُوٹھ
ختم ہو جائے گی اُس کی اور تیری دوستی
ایک ہو جائیں گے مل کر ماضی و فردا و حال
اور ان لمحات کے پانی میں تو ہو گا کنول!
شدتِ طوفاں کی پھنکاروں سے بے غم، بے نیاز
وقت کی لہروں پہ طالب رقص فرماتا ہُوا
گلشن ہستی کا پھول!
عظمت انساں نمود!

رنگ

پڑ گئے پیلے جو پتّے تھے ہرے
رنگِ گلشن دیکھیے کیا ہو گیا
رنگ بدلا ہے فضائے دہر نے
یا فنونِ رنگ میں مَیں کھو گیا!

سبز پتّے پک کے پیلے ہو گئے
زرد رنگ اُن کا سنہرا ہو گیا!
پڑ کے سونا آگ میں کندن بنا
رنگ قدرے اور گہرا ہو گیا!

جو زمرّد تھا زرِ نایاب ہے
پختگی کا رنگ اس میں آ گیا
اک نرالی شان پیدا ہو گئی
حُسنِ زرّیں تن بدن پر چھا گیا

تھا جو "برگِ سبز" ہے اب "برگِ زرد"
کیا نیا رنگ اور نرالا رُوپ ہے
وہ بھی تھا مرغوب یہ بھی ہے پسند
ٹھنڈی چھاؤں وہ یہ پیاری دُھوپ ہے

تیرا ہر اک رنگ ہے مجھ کو پسند
تیرے ہر اک رُوپ پر ہوں میں نثار
تیری صنّاعی کا ہے عکسِ جمیل
جامۂ طاؤس کے نقش و نگار

مجھ کو اپنے پیار کا وہ رنگ دے
چڑھ سکے جس پر نہ کوئی اور رنگ
جس کی یک رنگی میں ہوں رنگینیاں
جیسے ہے رنگین طالب کی اُمنگ

خدائے محبّت

(مسز میری بیکر ایڈی کی مشہور کتاب کرسچین سائنس اینڈ ہیلتھ سے متاثر ہوکر)

خدا نے ہم کو خود جیسا بنایا — محبّت سے صداقت سے سجایا
وہ ہے لاانتہا پیار اور نیکی — دلِ انساں نے اس سے پیار پایا

محبت کا سبق اس نے پڑھایا — پرائی آگ میں جلنا سکھایا
دیا بیمار کی خدمت کا جذبہ — فرشتوں سے ہمیں اچھا بنایا

دلِ درد آشنا پانا غنیمت — اسے سمجھو خدا کی عین شفقت
زہے قسمت کسی کا دکھ بٹانا — کسی کے کام آنا ہے سعادت

مکمّل ہے خدا ہم بھی مکمّل — ہمارا دل بھی ہے صاف اور نرمل
ہمیں بیماریوں سے واسطہ کیا — کہ ہم خالق کی ہیں تخلیقِ اکمل

ہمہ گیر اس کی رحمت اور محبّت — ہمہ گیر اس کا ہے دامانِ شفقت
وہ ہر مشکل کو کر دیتا ہے آساں — وہ ہر بیمار کو دیتا ہے صحّت

یقیں کے ساتھ شامل ہو دعا بھی — تو سن لے عرش پر بیٹھا ہوا بھی
غرض سے ہو نہ آلودہ محبّت — تو بن جائے محبت ہی خدا بھی

میں طالب ہوں مرا مطلوب بن جا — مرے آقا! مرا محبوب بن جا
مری بے چارگی کا ہے تقاضا — تو غالب ہو کے بھی مغلوب بن جا

(تمنا بی "ہما" لکھنؤ)

گوبھی کا پھول

سب سے اچھا پھول ہے گوبھی کا پھول
سامنے اس کے ہیں سارے پھول دھول

گورے گورے گال، مہ رو، سیم تن
اُجلا اُجلا اس کا نُورانی بدن

گیند مکھن کا ہے تودہ برف کا
جو ابھی ہے ابرِ سیمیں سے گرا

سبز آنچل میں ہے ٹکڑا چاند سا
یا زمرد میں ہے اک ہیرا جڑا!

خوبصورت بھی ہے کارآمد بھی ہے
پھول یہ پھولوں میں ہے نایاب شے

دوسرے پھولوں کی یہ ہمت کہاں
پیٹ بھر سکنے کی اہلیت کہاں

اُن کا گلدستہ بنا سکتے ہیں ہم
اُن کو زلفوں میں سجا سکتے ہیں ہم

کھلنا، مرجھانا ہے اُن کی زندگی
کرمکِ شب تاب سی تابندگی

رنگ و بُو سے بھوک مٹ سکتی نہیں
شعرِ تر سے پیٹ بھرتا ہے کہیں

شعر ہو جاتے اگر گوبھی کے پھول
شاعروں کو کچھ تو ہو جاتا وصول!

محض حسنِ دل نشیں کو کیا کریں
جنّت دیدار میں بھوکوں مریں

اب ادب بہرِ ادب، وہم و گماں
اب افادیت کا ہے سکہ رواں

رُوبل و ڈالر کے پروردہ غلام
آج کل شعر و ادب کے ہیں امام

اُن کے ہیں مدِّ نظر "اپنا مفاد"
فائدے کا اُن کو ہر اک گُر ہے یاد

نکہتِ گُل کو سمجھتے ہیں فضول
اُن کا منظورِ نظر "گوبھی کا پھول"

یہ ہیں اپنے راہروانِ با اصول
یہ وہ دانا ہیں جو بن جاتے ہیں فول!

ونکشا
لکھنؤ ۳ مئی ۱۹۲۲ء

(رہنمائے تعلیم دہلی)

لکھنؤ

ذہن و دل پر چھا گیا حُسنِ بلادِ لکھنؤ
عمر بھر آتی رہے گی مجھکو یاد لکھنؤ
اسکی مٹی میں بھی ہیں تہذیب کی رنگینیاں
شعر و نغمہ خاندانِ خانہ زادِ لکھنؤ

ہے نرالا حُسن اس کا اور انوکھا بانکپن
یہ گلستانِ معانی ، یہ چمن اندر چمن
اس زمیں کا ذرہ ذرہ علم و فن کا باغ ہے
اس کا ہر طائر ہے مرغِ خوشنوا شیریں دہن

پُر سکون اور روح پرور ہے فضائے دلکشا
دل لبھا لیتی ہے اسکی صاف اور ستھری ہوا
ہم مسافر بھی ہوئے ہیں اسکے فیضِ یاب
طالبِ اسرار کو گویا خزانہ مل گیا

دلکشا لکھنؤ ۶-۸-۶۶

لانگ فیلو ایک مشہور انگریزی نظم کا تاثر

۱- دن ختم ہو گیا اور رات کے پروں سے — گرتا ہوا اندھیرا عالم پہ چھا رہا ہے
یا اک عقاب کا پر جو اُسکے بازوں سے — اُڑتے میں گر گیا ہے، لہراتا آرہا ہے

۲- بارش کی دُھند میں سے آتے نظر ہیں مجھکو — گاؤں کے جھلملاتے روشن دیئے گھروں کے
اک سوگوار جذبہ، کرتا ہے دل پہ قبضہ — معذور ہو گیا ہوں اُس کے مقابلے سے

۳- یہ دل میں کچھ اُداسی یا ایک چاہ سی ہے — جو درد تو نہیں ہے لیکن ہے درد جیسی
کتنی مشابہت ہے کتنی مماثلت ہے — بارش کی دُھند جیسے لگتی ہے دُھند ہی سی!

۴- آؤ مجھے سُناؤ سادہ سا گیت کوئی — جو دل کے تار چھولے جو من کو شانت کر دے
افکارِ مضطرب کو جو دے سکوں کی لوری — جو دن کی کلفتوں میں راحت کا رنگ بھر دے

۵- رہنے دو اُونچے اونچے استاد شاعروں کو — تھے فلسفہ کے ماہر جو رازدانِ عالم
پاؤں کی چاپ جن کی برسوں سے گونجتی ہے — ایوانِ ذہن و دل میں بن کر صدائے پیہم

۶- نغماتِ گرم اُن کے عزم و عمل کے داعی — فوجی دُھنوں کی صُورت، پیغامِ جوش و ہمت
اُن کے کلام میں ہے تلقین کشمکش کی — لیکن میں چاہتا ہوں امشب سکون و راحت

۷- مجھ کو سنا وہ شاعر، نغمات جس کے دل سے — یوں پھوٹ کر ہوں نکلے، جیسے کہ مینہ برسے
ساون کے بادلوں سے یا بے کسی کسی کی — اشکوں کا بن کے دریا، جاری ہو چشمِ تر سے

۸- گو کاٹتا ہے دن وہ لڑ لڑ کے مشکلوں سے — آرام اور سکوں سے ہے رات اسکی خالی
سُنتا ہے دل کی خلوت میں راگ آسماں کے — کیفیتوں کی حامل ہے اس کی خوش خیالی

۹۔ ایسے ہی گیت رکھتے اپنے ہیں ہیں وہ قدرت
نبضِ غمِ بشر کو جو اعتدال بخشے
ایسے ہی گیت ہیں جو بنتے ہیں ابرِ رحمت
بعد از دعائے صادق جو بھی پہ برسے

۱۰۔ لاؤ کتاب ایسے مرغوب شاعروں کی
اُس میں سے حُسن کے کوئی اچھی سی چیز گاؤ
الفاظ شعر گو کو آواز کا فسوں دو
ذہن و دماغ و دل میں کیفیتیں سجاؤ

۱۱۔ بھر جائے دامنِ شب موسیقیوں کی لَے سے
افکارِ زندگی جو دن بھر رہے گوارا
عربوں کی طرح اپنے اپنے سمیٹ خیمے
چُپ چاپ اپنی رہ لیں، دل سے کریں کنارا

نئی دہلی ۱۶۔۷۔۶۷

دِلّی اور ہم

یہ وہ دِلّی ہے کہ دل سے جس کے دیوانے ہیں ہم
یہ وہ شمع زندگی ہے جس کے پروانے ہیں ہم
آئینہ ہے ہم سے اِسکے عہدِ زرّیں کی جھلک
اسکے تہذیب و ادب کے آئینہ خانے ہیں ہم
علم و فن کے موتیوں پہ جم گیا گرد و غبار
خاک کے ذرّات میں ملبوس دُردانے ہیں ہم
ہم پہ رہتی ہے نگاہ شفقتِ اہلِ نظر
محفلِ شعر و ادب میں جانے پہچانے ہیں ہم
حاضرِ خدمت کیا ہے جوہرِ قلب و دماغ
کم نگاہوں کی نظر میں پھر بھی بیگانے ہیں ہم
اب تو خویش و غیر کہتے ہیں ہمیں کچھ اور ہی
جب تو اک دُنیا سمجھتی تھی کہ فرزانے ہیں ہم
تمکنت سوداؔ کی طالبؔ، میرؔ کا رکھتے ہیں درد
باغ تو جانے ہے سارا پر نہ کچھ جانتے ہیں ہم

نئی دہلی ۱۴۔۷۔۶۸

اظہارِ عقیدت

چند دن ہوئے شری مہر چند مہاجن چیف جسٹس سپریم کورٹ آف انڈیا حرکت قلب بند ہونے سے سورگ سدھار گئے۔ وہ بھارت ماتا کے سچے سپوت اور آریہ جاتی کے اَن تھک سیوک تھے۔ اُن کے ساتھ مجھے کئی سال آریہ سماج (انارکلی) مندر مارگ نئی دہلی میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔ لا کالج لاہور میں اُن سے قانون بھی پڑھا۔ بطور اظہار عقیدت چند اشعار پیش ہیں۔

ہو گئی بے کار فرطِ غم سے گویائی مری
کھو گئی خاموشیوں میں نغمہ پیرائی مری

ہو گئے کچھ اور مبہم معنئ صبر و قرار
ہو گئی کچھ اور رسوا ناشکیبائی مری

وہ کہ جس کی ذات میں یکجا تھے مہر و ماہتاب
وہ کہ جس کے فیض کا حاصل ہے بینائی مری

وہ کہ تھا جس سے پڑھا میں نے سبق قانون کا
ہو گئی آسان جس سے جادہ پیمائی مری

تھا دلِ نوشیرواں جس کا ارسطو کا دماغ
فخر ہے مجھ کو کہ تھی اُس سے شناسائی مری

تذکرے تھے جس کی دانش کے دیارِ ہند میں
معترف تھی جس کی دانائی کی دانائی مری

وہ مفکر، کرم یوگی، رہنمائے پختہ کار
جس کی پیری پر بھی تھی قربان برنائی مری

خضرِ رہ تھا وہ کہ ہے جس کی رہنمائی کے طفیل
سرفرازی سے عبارت ہے جبیں سائی مری

سر جھکا جاتا ہے طالب آج اُس کی یاد میں
موجزن بحرِ عقیدت ہے دلِ ناشاد میں

نو وارد

(ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کی ہندی نظم کا ترجمہ برائے آل انڈیا ریڈیو)

ہو مبارک، ہو مبارک، ہو مبارک صد ہزار — ہو مبارک ہو مبارک، ہو مبارک لاکھ بار
جشن کی سج دھج نرالی ہے نرالی شان ہے — جشن یہ جنتا کا ہے، جنتا کا اس میں مان ہے
جھنڈیاں لہرا رہی ہیں جن کے بندن وار سی — ہے فضا میں گونجتی آواز جے جے کار کی

میں کہ اک ناچیز انساں رہنے والا گاؤں کا — ڈرتے ڈرتے آپ کے دربار میں آ ہی گیا
ہے قصیدہ ہی کوئی اور ہے نہ کچھ اُپہار ہی — ہاتھ خالی اب کے یوں ہی آ گیا بیکار ہی
لا سکا اب کے نہ کچھ بھی درگزر کر دیجیئے — بس نگاہ مہر مجھ پر بندہ پرور کیجیے
کیا تلاشی لیجیئے گا؟ شک مگر بے کار ہے — ہے نہ میرے پاس بم، حربہ نہ اور ہتھیار ہے
جو بغل میں ہے دبی اور اس لبادے میں چھپی — ایک بوسیدہ پھٹی سی ہے پرانی پوٹلی
بند وہ الفاظ ہیں اس میں مرے اجداد کے — جو انہوں نے وقت رحلت مرحمت ہم کو کیے
بے گناہوں کا لہو جب راہ سے ڈھل جائیگا — ٹوٹ کر گر جائیگا حلقہ کڑی زنجیر کا
جب مگر بجنے لگے تب پوٹلی کو کھولنا — اور پورے زور سے تم اونچے سُر میں بولنا
سینکڑوں سالوں کی ہے یہ روح فرسا داستاں — کھیتیاں سوندی ہوئی، برباد سونی بستیاں
آہ لاشوں سے پٹی وہ خاک خوں کی ندیاں — کہہ رہی ہیں ہم سے اپنی داستانِ خونچکاں
دے رہی ہیں یہ گواہی بے گمان و برملا — کیا نہیں ہم نے سہا، لیکن نہیں کچھ بھی کہا
بس وہی الفاظ ہی تھے جو بزرگوں نے کہے — بس وہی الفاظ ہی تھے جو زباں تک آ سکے

پڑھی ہی در بدر پھری یہاں ہوتی رہی ہے سرکشی ــ ظالموں کے ظلم سے انسانیت پستی رہی!
اس پرانی پوٹلی کا جانتے کیا دستور ہے ــ اس کا ہر اک لفظ مجھ کو مشعلِ کوہِ نور ہے!
لیکن ان الفاظ کی باتیں کا دن آئیگا کب؟ ــ دل ابھی وہ دور ہے آئیگا جب آئیگا جب!
یہ ادب پارہ نہیں میں شرم سے ہوں سرنگوں ــ سوچتا رہتا ہوں دل میں کیا ہوں کیا کروں

ہے مجھے معلوم جتنا آپ کا لطف و کرم ــ دستگیر یکساں ہے سب کا رکھتا ہے بھرم
پھر بھی ہر انداز پر چھپنے کی یہ کوشش ہے کیوں! ــ سر چھپانے کی مجھے یہ لغو سی خواہش ہے کیوں؟
چھوٹ کر یہ ہاتھ سے ڈر ہے نہ گر جائے کہیں ــ اس سے بڑھ کر بیش قیمت چیز ہی کوئی نہیں
لفظ تھے وہ یا وصیت تھی مرے اجداد کی ــ خواہ کچھ سہنا پڑے یہ تم کو مگر کہنا وہی
ہاں وہی اور بس وہی جسکو سمجھتے ہوں سبھی ــ جس کے مفہوم و مطالب سے ہو سب کو آگہی
یہ اذیت اسلئے خاموش سہنے دے مجھے ــ اور جلسے سے الگ اے دوست رہنے دے مجھے

کیا کمی ہے آپ کو ہے آپ کو سب اختیار ــ آپ ہی کی شان میں ہوتی ہے جے جے کی پکار
مجمعِ افراد کی ہوتی نہیں کوئی زبان ــ پھر بھی پاؤ گے اسے کرتے ہوئے دکھ کا بیان
پاؤں تو ہوتے نہیں اسکے مگر چلتا ہے یہ ــ آتشِ سوزِ دروں سے روز و شب جلتا ہے یہ
فی الحقیقت معجزہ ہے یہ جھپکنا آنکھ کا! ــ بالیقیں ہے یہ کرشمہ حال لیل و نہار

پھر اکیلے میں مجھے آنے لگا ایسا خیال ــ کیا نہیں بیکار سا میری اداسی کا سوال
اپنے دل میں سوچتے گا کیا نہیں میلے میں آج ــ دیکھنے گا رنگ و بو کا ایک دلکش امتزاج

رتھ بنے پھولوں کے گھوڑے ناچتے ہیں شان سے
اور جنگلی ناچتے ہیں مدھ بھری مسکان سے

بھولی جنتا ہے مگن، خوش عالموں کی انجمن
سر خوشی ہے ہر کسی کے ذہن و دل میں موجزن

ہیں یہی جذبات سب کے اور سبھی مسرور ہیں
فکر و غم انکے دلوں سے آج کوسوں دور ہیں

کتنے خوش ارض و سما ہیں کتنی خوش جنتا ہے آج
کتنا خوش ہندوستان ہے! آج ہے جنتا کا راج

ہو مبارک ہو مبارک، ہو مبارک صد ہزار
ہو مبارک ہو مبارک، ہو مبارک لاکھ بار

نئی دہلی ۱۵-۴-۶۸ (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

مہاتما ہنس راج (شردھانجلی)

مہاتما کہیں تجھے کہ تجھ کو دیوتا کہیں
بہارِ زندگی کی تُو نے دان کیں جوانیاں

جلا کے اپنا خون، اہتمام نُور کا کیا
کہ بخش دیں ہیں آبِ جوئے علم کو روانیاں

یہ کالج اور مدرسے یہ نُورِ علم کی طلب
ترے ہی فیضِ عام کی ہیں ضو فشاں نشانیاں

نہ مال و زر کی آرزو، نہ حرصِ عزّ و جاہ کی
حقیقتیں یہ وہ ہیں جن سے مات ہیں کہانیاں

دیئے جو ہوش و جوش کے دلوں میں جل رہے ہیں آج
نگاہِ نکتہ بیں میں ہیں تری ہی ضو فشانیاں

تری نگاہِ خاص سے نگاہِ بے غرض ملی
غرض سے بے نیاز ہیں ہماری خوش بیانیاں

زہے نصیب ہم کو تیری یاد کا شرف ملا
زہے نصیب کہہ رہے ہیں ہم تری کہانیاں

نئی دہلی
۱۲ر اپریل ۱۹۶۰ء

وقت کا دریا

وقت کے بہتے ہوئے دریا میں ہے کیا دل کشی
اُس کے گردابوں میں بھی ہوتا ہے رقصِ زندگی!
اُس کی موجیں اور لہریں بے مثال و بے حساب
اُن کی تخفیص اور گنتی زندگی سے دل لگی!

ہے مسلسل وقت کا دھارا کہ دریائے رواں
رات دن محوِ سفر لمحات کا ہے کارواں
جادۂ ہستی میں ماہ و سال کے ہیں سنگِ میل
فکرِ انساں نے کیے تخلیق یہ ذہنی نشاں!

خوب تھا ماضی تو مستقبل بھی ہوگا خوب ہی
خوبیِ حالات کی اُمید ہے دل میں بسی
فیضِ رحمت کے یقیں سے جل اُٹھا دل میں چراغ
ظلمتوں میں بھی نظر آنے لگی ہے روشنی!

ذہن میں کوندا سا لپکا، دل نے اک چٹکی سی لی

صبح آغاز سفر کی یاد تازہ ہو گئی
سامنے آنکھوں کے لہرانے لگے کل اور آج
دیکھئے طالب دکھائے اور کیا کیا زندگی

کٹ گئی کچھ تو مزے سے اور کچھ کٹ جائے گی
فکر کیا ہے موت کو آنا ہے اک دن آئے گی
ہم تو کب سے اُس کے سواگت کے لئے تیار ہیں
وہ ہمارے واسطے نایاب تحفہ لائے گی

وہ حیاتِ نَو کا تحفہ، بے مثال و بے بہا
جس کا جادو ہر پرانی شے کو کر دے گا نیا
یہ پرانا پیرہن بن جائے گا ملبوسِ نَو
اک نئے جیون کی ہوگی از سرِ نو ابتدا

زندگی پھر مسکرائے گی نئے انداز سے
گیت پھر ہستی سنائے گی نئی آواز سے
پھر فرشتے رشک فرمائیں گے اُس مسکان پر
کھیلتی ہے جو لبِ معصوم پر آغاز سے

نُور بن کر پھر کسی دل میں سما جائیں گے ہم
آس اور اُمّید کی دُنیا بسا جائیں گے ہم
پھر کسی مایوس کے دل میں کریں گے روشنی
چاند بن کر پھر کسی کے گھر میں آ جائیں گے ہم!

پھر کسی صحنِ چمن میں آئیں گے بن کر بہار
پھر کسی کی زندگی میں آئے گا ہم سے نکھار
پھر کسی کی ماتا اور پیار کو پائیں گے ہم
پھر سبھی کچھ چھین لے گی گردشِ لیل و نہار!

پھر غمِ جاناں غمِ دَوراں سے ٹکرا جائے گا
زندگی کا منچ پھر ناٹک نیا دکھلائے گا
پھر اصول اور مصلحت کی کشمکش بڑھ جائے گی
پھر دلِ ناداں رموزِ زندگی سُلجھائے گا!

اُوب سا جائے گا دل مانوس محسوسات سے
دائمی اقدار سے، بے کیفیٔ حالات سے
کیا پُرانے چاند تارے، کیا پُرانا آسمان
چِڑ سی ہو جائے گی دل کو ہر پُرانی بات سے!

ہر پُرانی بات اک آزار سی ہو جائے گی
جُستجوئے آب ودناں بیکار سی ہو جائے گی
دم زدن میں پھاند جائیں گے حدودِ زندگی
ہر رُکاوٹ ریت کی دیوار سی ہو جائے گی

اک نئی دُنیا بسانے کو پہنچ جائیں گے ہم
اک نئی محفل سجانے کو پہنچ جائیں گے ہم
تک رہی راہ اپنا باغ ہیں ہر شاخِ گل
پھول بن کر مسکرانے کو پہنچ جائیں گے ہم

کوئی دن میں طفلکِ ناداں جواں ہو جائے گا
یہ نیا پودا نہالِ گل فشاں ہو جائے گا
پھر اُسے برباد کر دے گا نظامِ زندگی
پھر حیات و موت کا چکّر رواں ہو جائے گا

عہدِ نَو عہدِ کہن کے نام سے شرمائے گا
اور پھر یہ عہدِ نَو عہدِ کہن کہلائے گا!
بس یونہی چلتا رہے گا یہ مسلسل ہیر پھیر
زندگی زندہ رہے گی اور کوئی مر جائے گا!

کوئی مر جائے گا طالب یہ خیالِ خام ہے
موت بھی تو زندگی کی ابتدا کا نام ہے
جیتے ہیں مر مر کے اور مرتے ہیں جینے کے لئے
زندگی ظالم ہے، لیکن موت پر الزام ہے!

موت پر الزام دینا بزدلوں کا کام ہے
ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں زندگی بدنام ہے
اس میں تلخی بھی ہے، رنگینی بھی ہے، پھیکا پن بھی ہے
اس پہ بھی کس درجہ شیریں زندگی کا جام ہے!

چاہتا ہے دل یہ مے پیتے رہیں پیتے رہیں
کچھ بھی ہو جیسے بھی ہو، جیتے رہیں جیتے رہیں
کشمکش سے پھٹ بھی جائے دامنِ ہستی اگر
سوزنِ تدبیر سے سیتے رہیں سیتے رہیں

اور نہ جب قابلِ مرمت کے رہے یہ پیرہن
پھاڑ کر اس کو بنا لیں آرزوؤں کا کفن
اک نیا چولا عطا کر دے گا ربِّ دو جہاں
اک نئے جیون کی جھانکی، پھول سا کومل بدن

نئی دہلی ۔ ۱۶ ، جون ۱۹۶۸ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

ہمالہ کی چوٹیاں

پھر یاد آرہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں
پھر دل لبھا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

پھر سُن رہا ہوں اُن کا محبّت بھرا پیام
مجھ کو بُلا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

وہ گیت جن کو سُن کے مُنش بن گئے رِشی
صدیوں سے گا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

اس برف کے لباس میں ڈھانپے ہوۓ دلوں کی آگ
کیوں دل جلا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

اَے اشتیاقِ دید! مبارک کہ بے دریغ
جلوے لُٹا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

رشیوں کی ہم نوا ہیں، ثنا خوانِ ذاتِ پاک
دیدوں کو گا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

سیراب کیوں نہ ہم بھی کریں کشتِ آرزو
دریا بہا رہی ہیں ہمالہ کی چوٹیاں

طالبؔ کے ذہن و دل میں بسی ہیں بنا کے گھر
اپنا بنا رہی ہیں، ہمالہ کی چوٹیاں

نئی دہلی - ۱۷ جون ۱۹۶۹ء

تسخیرِ ماہتاب اور شاعر

عزم و عمل نے توڑ دیا چاند کا غرور
ہم نے کیا وہ کام جو کوئی نہ کر سکا

ڈھونڈے ہزار عیب تسخیرِ ماہتاب کے
ثابت کیا کہ چاند کا چہرہ ہے بدنما

ویران کوہ و دشت ہیں نا پید زندگی
آیا نظر نہ چاند کا باسی کوئی وہاں

کھولے ہوئے ہیں منہ کئی آتش فشاں پہاڑ
گو اب اگل نہیں رہے وہ آگ اور دھواں

معراجِ حسن اس کو سمجھتے ہیں اہلِ دل
روزِ ازل سے حسن کی مانی ہوئی مثال

محبوب کو بھی شوق سے کہتے ہیں لوگ "چاند"
بخشا ہے شاعروں نے اسے ہالۂ جمال

ہم جا کے دیکھ آئے ہیں وہ سرزمینِ حسن
اس پہ جما کے پاؤں وہاں ہم چلے پھرے

دیکھا بغور و خوض تو کچھ بھی نہ تھا وہاں
جھنڈا بشر کا گاڑ کے ہم سرخرو ہوئے

چھوڑے ہیں خاکِ ماہ پہ ہم نے نقوشِ پا
یا عظمتِ بشر کے نشاں ثبت کر دیے

اک خوابِ دلنواز کی تکمیل ہو گئی
جو چندر لوک تھا وہاں انسان پہنچ گئے

یہ فتحِ ماہتاب ہے انسان کا فروغ
تاریخِ آدمی کا نیا باب کھل گیا

پردہ اُٹھا ہے از دلِ ماہتاب سے — دامن پہ چاند کے تھا جو داغ دُھل گیا

لو آگئی حقیقتِ عریاں بھی سامنے — خونِ تخیلات کو سمجھے ہوئے روا
جذباتِ انبساط کی دُنیا اُجاڑ کر — تحقیق کہہ رہی ہے کہ یہ قتل ہے بجا

خوشبو کی جہان بین سے خوشبو ہوا ہوئی — کب تجزیہ کو کیفِ تجمل کی تھی خبر
بیگانۂ مذاقِ عقیدت، دلیل باز — کیفیتوں کی موت ہے تحقیق کی نظر

اپنی نگاہ میں چاند رہے گا ہمیشہ چاند — محبوبِ دلنواز کی صورت سجا ہوا
رنگینیٔ خیال کی رنگینیوں کا عکس — قلب و نظر میں حُسن کا جلتا ہوا دیا

اہلِ نظر کو چاند سے جیسا رہا ہے پیار
ایسا ہی پیار اُس سے رہے گا صُبح و شام
عشق اُس میں حُسنِ یار کی پائے گا دلکشی
شاعر کی آنکھ اُس کو کرے گی سدا سلام

نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۶۹ء — "پیامِ مشرق" دہلی

شرافت

زہے قسمت شرافت ایسی شے داتا نے دی ہم کو
کسی قیمت بھی جو بازارِ دوراں میں نہیں ملتی
خریدی جا نہیں سکتی جو منعم کے خزانوں سے
صفت انساں کی ہے لیکن ہر انساں میں نہیں ملتی

شرافت خون میں ہوتی ہے، پیسے میں نہیں ہوتی
اِسے اہلِ نظر پہچان لیتے ہیں بہ آسانی
نگاہِ جوہری میں بچ ہی جاتا ہے زرِ خالص
اسے معلوم ہے ہوتی ہے کیا ہیرے کی تابانی

نگاہِ لطفِ حق سے چشمِ دل پاتی ہے بینائی
حقیقت آشنا آنکھیں حقیقت بھانپ لیتی ہیں
محبّت کی نظر پہچان لیتی ہے محبّت کو
شریف انسان کی آنکھیں شرافت بھانپ لیتی ہیں

نئی دہلی ۳ فروری ۱۹۶۹ء

مشکل کشا

دستِ سوال کس لئے کرتا ہے تو دراز — داتا دیال ہو گا تو دے گا بلا کے خود
کیوں بن کے بھک منگا تو بھٹکتا ہے دربدر — پوری کرے گا تیری ضرورت وہ آ کے خود

ہر حال میں رہتا ہے ترے سر پہ جس کا ہاتھ — کیا اب وہ چھوڑ دے گا تجھے تیرے حال پر
بھولی نہیں ہیں اُس سے کسی کی ضرورتیں — بخشش کا انحصار نہیں ہے سوال پر

جس نے ہزار کشٹ نوارن کئے ترے — جو تیری مشکلات میں مشکل کشا بنا
دکھ درد میں شریک رہا بن کے دستگیر — ہر دردِ بے دوا کی بھی دوا بنا

دستِ سخا نے تجھ کو نوازا ہے آج تک — رکھ اعتماد تجھ کو نوازے گا آج بھی
پوری وہی کرے گا ترے من کی کامنا — تیرے ہر ایک دُکھ کا کرے گا علاج بھی

بیمار ذہن و دل کو جو صحت کا دان دے — جز شفقتِ کریم، مسیحا نہیں کوئی
کر دے جو انتشار زدہ دل کو مطمئن — طالب بجز یقین مداوا نہیں کوئی

---

۲۶ راکتوبر ۱۹۶۹ء — (تماہی "ہما" لکھنؤ)

وجے کا سہرا

(اپنے سپتر عزیز وجے کپور کی تقریب شادی ۱۰-۷-۱۹۷۵ء)

قطعہ

بہترین سہرا ہے دنیا میں وجے کا سہرا
اس سے بڑھ کر نہیں دیکھا کوئی اچھا سہرا
جی میں آتا ہے اسے باندھوں وجے کے سر پر
ہے چمکتا ہوا قسمت کا ستارہ سہرا

مہر و انجم کی شعاعوں سے بناؤں سہرا
آ مرے چاند ترے سر پہ سجاؤں سہرا
شوق کہتا ہے کہ سہرے کی بلائیں لے لوں
جذبِ دل کہتا ہے آنکھوں سے لگاؤں سہرا
میں نے امید کی کرنوں سے بنایا ہے اسے
دیکھنے والا کوئی ہو تو دکھاؤں سہرا
یہ دعاؤں کی وجہ ہے کہ شرافت کی ہو جیت
اسی احساس کا اظہار بناؤں سہرا

اس سے مہکے گا سمن اور دیے کا جیون
گلشنِ صدق کے پھولوں میں بساؤں سہرا
خویش و اغیار ہیں سب چاہنے والے اُس کے
اب دکھاؤں کسے، اور کس سے چھپاؤں سہرا
شیشۂ ذہن پہ تصویر بناؤں اس کی
آئینہ خانۂ خاطر میں سجاؤں سہرا
اس کو محفوظ کروں دل کے طرب خانے میں
اور جب چاہوں تصور ہی میں گاؤں سہرا
کیف و جذبات کی دُنیا کی زبان مُوں طالبؔ
وہ کہیں اور میں کیسے نہ سُناؤں سہرا

نئی دہلی ۲۰ فروری ۱۹۷۰ء
(بسنت کے پھول)

فکر و فن کو بے نیازی کی ادا دیتے رہو
جو نہ سُن سکتے ہوں اُن کو بھی صدا دیتے رہو

(طالب چکوالی)

خیالوں کی بستی

یہ جبر و جور کی آندھی یہ ظلمتوں کا فروغ
ہوا کے تند تھپیڑے دیئے کی لو کے خلاف!
ہوئے ہیں درپئے آزارِ روشنی کے عدو
فصیلِ نور میں ڈالے ہیں ظلمتوں نے شگاف

ترس گیا ہے تصور حسیں نظاروں کو
کبھی تھیں پیشِ نظر، کوہ قاف کی پریاں
کہاں گئے وہ تخیل کے قصر رنگا رنگ
کہ جن کا عکس تھا ہستی کی ہفت رنگ کماں!

یہ چمچماتی ہوئی آبنوس کی سڑکیں
یہ جگمگاتی ہوئی مثلِ کہکشاں راہیں
دِلوں کو کھینچ رہی ہیں مثالِ مقناطیس
نظر فریب نگاہیں، دبی دبی آہیں

خوشی سے مست نگاہوں کا رقص ہوشربا
وہ انگ انگ، پہ چھایا ہوا شباب کا رنگ!
فضائے شوق میں نورِ جمال کے جگنو
دلِ فسردہ میں نوخیز زندگی کی اُمنگ!

خیال و خواب کی دُنیا کا ہے عجب عالم
کبھی خیال، کبھی خواب کی حکومت ہے
کبھی تو زندگی دیتی ہے موت کو دعوت
پیامِ مرگ کبھی زندگی کی دعوت ہے

خیال و خواب کی دُنیا ہے زیست کا ساماں
یہ انتشار زدہ دل کا اک سہارا ہے
سُلجھ نہ جائیں کہیں اُلجھنیں خیالوں کی
کسی نے دُور سے طالبؔ مجھے پکارا ہے!

مجھے پکارا ہے کس نے؟ یہ کس کی ہے آواز؟
کہ سازِ فطرت خاموش گنگنا اُٹھا!
عجیب لوچ تھا اُس میں، عجیب میٹھا پن
ربابِ دل کا ہر اک تار جھنجھنا اُٹھا

حریمِ شوق میں بجنے لگی ہے شہنائی
لبِ خموش پہ نالوں کی آمد آمد ہے
دماغ و دل بچھے جاتے ہیں فرشِ رہ بن کر
نئے نویلے خیالوں کی آمد آمد ہے!

یہ ذوق و شوقِ تماشا کی خوش نصیبی ہے
کہ بزمِ حسنِ تخیل سجی ہے پہلے سی
زہے نصیب ہے معمورۂ خیال آباد
بڑے جتن سے بسائی ہے میں نے یہ بستی!

کہاں کہاں میں بھٹکتا رہا زمانے میں
کہاں کہاں نہ بسائی خیال کی دنیا
نہ کیسے کیسے سجایا اسے تصور سے
نہ کیسا کیسا تمنا نے اس کو روپ دیا!

خوشا نصیب یہ مشکل بھی حل ہوئی آخر
بڑی کٹھن تھی سمسیا بڑا ادق تھا سوال
بتائی ہم نے بھی کٹیا اسی نگریا میں
ہمارے خواب سے اچھا رہا ہمارا خیال

بسے ہیں اس میں خیالات کے حسیں پیکر
کہ جن کے دم سے ہیں اس کی فضلیں باغ و بہار
ہوا میں رہتی ہے نکہت نئے خیالوں کی
نئے شگوفوں سے رہتا ہے تازہ دم گلزار

یہیں تو رہتی ہیں حسنِ خیال کی پریاں
یہیں تو فکرِ فلک رس نواس کرتا ہے
یہاں کے لوگ ہیں مستِ مئے نشاطِ خیال
غریقِ فکر کو غم کب اداس کرتا ہے

خیال و خواب کی بستی ہے زیست کا حاصل
اسی سے صبر اسی سے سکون ملتا ہے
اسی کی گود میں ملتی ہے شفقتِ مادر
اسی سے پیار کے طالب کو پیار ملتا ہے

نئی دہلی - مئی ۱۹۷۰ء

باپُو

(شری سبھدرا نندن پنت کی ہندی نظم کا ترجمہ
(برائے آل انڈیا ریڈیو)

کن عناصر سے بناؤ گے بشر کی فطرت؟
کیا بدل ڈالو گے انساں کی مقدّر قسمت؟
کیسے انوار سے بھر دو گے فضائے عالم؟
کن اُجالوں سے مٹاؤ گے دلوں کی ظلمت؟
کیا اہنسا سے جِلا پائے گا انسان کا دل
کیا صداقت دلِ انساں کی بنے گی زینت؟
کیا امر پریم کے نغماتِ مسلسل کے طفیل
زیست جمہور کی بن جائے گی رشکِ جنّت؟
کیا دکھائے گا نیا دَور یہ دلکش منظر
رُوح کے فیض سے سج جائے گی انسانیت
پریم کی شکتی سے نابود ہمیشہ کے لئے
ہو کے رہ جائے گی جبر او بدی کی طاقت

جب کیا باپو ترے تیج کا دل نے درشن
روم روم اپنا ہنسا، یاس کے ٹوٹے بندھن
روحِ ذیشان ہی کا ہے فیضِ جلالِ کردار
بن گئی دھرا ذرا ذرا ہی خوشی کا درپن!
ہے صداقت ہی فقط عرش بریں کا زینہ
اُس کو پانے کے لئے ایک یہی ہے سادھن
خود شناسی ہے ازل سے اُسی گلشن کا پھول
جس کے پھولوں کا سدا رہتا ہے قائم جوبن
کیا خبر کتنے بشر جان سے دھوئیں گے ہاتھ
لوگ کہتے ہیں کہ ہنستے کو ہے یگ پر درتن!
کچھ بھی ہو صورتِ حالات کا ہے یہ اعلان
ہر بشر ستیہ اہنسا کا کرے گا پوجن
دیوتاؤں کے لئے کام سنوارے تو نے
اے پیمبر! نئی تہذیب کے یگ کے جیون
روحِ انساں کی فضیلت کو ابھارا تو نے
بالیقیں ہیں ترے کردار سے راہیں روشن!
تو نے بدلا ہے خیالات کا دھارا باپو
اک نئے دور کا طالب تھا ستارا، باپو

نئی دہلی - مئی ۱۹۷۶ء
(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

آہ! منوّر لکھنوی

تاریخ وفات ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء

اُردو زباں کا ماہِ منوّر ہوا غروب
نُورِ نگاہِ اہلِ بصیرت چلا گیا
کھویا ہے اہلِ ذوق نے اِک بے نظیر دوست
وہ پیکرِ خلوص و شرافت چلا گیا

جذباتِ بے زباں کو زباں دوں تو کس لئے
الفاظ ہی نہیں جو غمِ جانستاں کہوں!
ذکرِ وفاتِ دوست نہیں اپنے بس کی بات
کیا ترجمانِ زیست کو خُلد آشیاں کہوں؟

مغموم شاعری ہے تو انسانیت اُداس
دونوں کا ایک گوہرِ شہوار کھو گیا
تلسی کا، کالی داس کا، گیتا کا ترجماں
وہ خوش بیان مردِ خوش اطوار کھو گیا

فن کار باکمال تھا انسان بے مثال
سادہ مزاج، خوش [illegible]

چھوڑا ہے نظم و نثر کا وہ گنج بے بہا
طالب دل و دماغ کی دولت کہیں جسے

نئی دہلی - ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

یادِ رفتگاں

ہمدرد، ہم خیال گئے، ہم نظر گئے
نکتہ شناس، واقفِ عیب و ہنر گئے

کیفیؔ[1] کہاں ہیں، حضرت محرومؔ[2] ہیں کہاں
وہ پیکرِ خلوص، منورؔ[3] کدھر گئے

نایاب موتیوں کا بنایا تھا ایک ہار
ایک ایک کر کے گوہرِ یکتا بکھر گئے!

مرجھا گئے وہ پھول تھی جن سے بہارِ باغ
جو فخرِ گلستاں تھے وہ گلہائے تر گئے

کب سے نگاہِ شوق ہے مصروفِ جستجو
یارانِ پُر خلوص خبر کیا کدھر گئے

---

[1] علامہ کیفی دہلوی [2] حضرت تلوک چند محروم [3] حضرت منور لکھنوی

کچھ بھی نہ اُن کی قدر کی جب تک وہ تھے یہاں
اب ہاتھ مَل رہے ہیں کہ لعل و گہر گئے

برہم ہوا مزاج، پریشانیاں بڑھیں
لیکن خیال و فکر کے گیسو سنور گئے

اب زندگی کو کون دکھائے گا آئینہ
آئینۂ حیات کے آئینہ گر گئے

دستورِ کائنات ازل سے یہی رہا
ہے زندگی انھیں کی جو کچھ کام کر گئے

راتیں کٹیں تلاشِ سکون و قرار میں
دن یادِ رفتگاں کے سہارے گزر گئے

کیسے کہیں کہ اُن کو بھی زندگی سے پیار
جو لوگ زندگی کے تقاضوں سے ڈر گئے

طالب کسی کی یاد میں جینا ہے زندگی
یہ کیا ہوا کہ غم نہ سہا اور مر گئے

نئی دہلی۔ ۱۹ اگست ۱۹۷۰ء (تمام ہی تھا لکھنؤ)

یادِ منوّر

دہلی کی متعدد ادبی انجمنوں کی طرف سے غالب
اکاڈمی نئی دہلی میں ۲۹ اگست ۱۹۷۰ء کو حضرت
منوّر لکھنوی کی یاد میں منعقدہ جلسہ میں پڑھی گئی۔

دل میں ہے اُس کی یاد بدستور آج بھی
مرہونِ غم ہے طالب رنجور آج بھی
وہ پیکرِ خلوص منوّر فدائے فن
میرے دلِ حزیں سے نہیں دور آج بھی

وہ ترجمانِ زیست منوّر کہیں جسے
گلزارِ علم و فن کا گلِ تر کہیں جسے
وہ مردِ پاک باز وہ علم و ادب کی جان
محبوبۂ حیات کا زیور کہیں جسے

اُردو زباں کو اُس کے تراجم پہ ناز ہے
تحریر دل پذیر، ادا دل نواز ہے
میدانِ نظم و نثر کا ہے شہسوار وہ
ہے واقفِ رموز، وہ دانائے راز ہے

باغِ ادب میں پھول ہیں ایسے تو بے شمار
لیتے ہیں رنگ و بو جو بہاروں سے مستعار
لیکن وہ پھول اور ہی ہوتے ہیں میرے دوست
رہتی ہیں جن کے دم سے بہاریں بھی پُر بہار

ایسا ہی ایک پھول منوّر تھا بیگماں
خوشبو سے جس کی آج بھی مہکا ہے یہ جہاں
یادیں ہیں جس کی آج بھی نکہت بکھیرتی
جس کا کلام آج بھی ہے رشکِ بوستاں

نئی دہلی ۱۰ اگست ۱۹۷۰ء

سوشل سدھار

نازک سے دل کو چیر گئی نوک خار کی
لیڈر کو فکر کھا گئی سوشل سدھار کی
ہے فکر ہی تو موت سکون و قرار کی
تقریر اُس نے پھر بھی بڑی زوردار کی!

فرمایا "ہم تو شور قیامت مچا چکے
قصے تباہیوں کے ہزاروں سُنا چکے
میدان دار و گیر کے نقشے دکھا چکے
لیکن نہ تم نے راہ نئی اختیار کی!

"اب تک وہی فضول رواجوں کا زور ہے
"اب تک وہی فضول سی رسموں کا شور ہے
"دنیا کا ڈھنگ اور، چلن اپنا اور ہے
عادت ہی تم نے چھوڑ دی سوچ اور بچار کی!

تقریر سن چکے تو سخن گر کو دیکھئے
حرص و فریب مکر کے پیکر کو دیکھئے
جھوٹوں کے بادشاہ کے تیور کو دیکھئے
تصویر دل فریب ہے چوروں کے یار کی!

لڑکے کی ہو سگائی تو جی بھر کے لیں گے آپ
لینے کا اور ناپ ہے، دینے کا اور ناپ
سب کچھ روا ہے آپ کو، کیا پنیہ اور پاپ
تخصیص ناروا ہے یہاں نور و نار کی!

مانا کہ غم نصیب کے غم خوار آپ ہیں
مانا کہ بے نوا کے مددگار آپ ہیں
مانا کہ نرادھار کے آدھار آپ ہیں
اور آپ ہی کو فکر ہے زار و نزار کی

کچھ فکر بھی ہے دیش کی حالت ہوئی ہے کیا
کچھ فکر بھی ہے قوم کو گھن کیوں ہے لگ گیا
کچھ فکر بھی ہے حال ہمارا یہ کیوں ہوا
کیوں ہے خزاں کے ہاتھ میں قسمت بہار کی

خوفِ بشر نہیں ہے تو خوفِ خدا کرو
اس نیم جاں سماج پہ کچھ تو دیا کرو
جو کر سکو، زباں سے وہی کچھ کہا کرو
کچھ فکر بھی تو چاہیے اپنے وقار کی

ہے لطف جب کہ اپنے ہی گھر سے ہو ابتدا
وہ کیا طبیب خود کو جو اچھا نہ کر سکا
ذوقِ عمل ہو ساتھ تو بھاشن کا ہے مزا
باتوں سے بات بن نہ سکے گی سدھار کی

جو کچھ کہو، وہ کرکے دکھاؤ تو بات ہے

کردار ہی سے وقعت و شانِ حیات ہے

طالب یہی تو رازِ بقا و ثبات ہے

بنیاد ہے یہی تو بشر کے وقار کی

(آریہ سماج مندر مارگ کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی)

نئی دہلی ۲۲۰ نومبر ۱۹۷۰ء ("ریفارمر" دہلی)

کاغذ کے پھول

پھول کاغذ کے ہیں خوشبو سے اُنھیں کیا نسبت

کاغذی پھولوں میں بُو باس کہاں سے آئی

صحبتِ لالہ و گُل اُن کے مقدّر میں نہیں

اُنھیں گلشن کی ہوا راس کہاں سے آئی

کاغذی پھولوں کا گُل دستہ خریدا میں نے

یہ سمجھ کر کہ بڑھے گی مرے گھر کی زینت

ایک گُل دانِ منقش میں سجایا اُن کو

ایسا محسوس ہوا آ گئی گھر میں جنّت

میں نے خونِ دلِ پُرشوق سے سینچا اُن کو
تاکہ پیدا ہو مہک اُن میں خلوصِ دل کی
اُن کی خوشبو سے معطّر ہو مرے گھر کی فضا
بادۂ لطف سے لبریز ہو جامِ ہستی

یہ تھا وہ خواب جو نہ شرمندۂ تعبیر ہوا
شوق و اُمید کی تکمیل کہاں ممکن تھی؟
مرے جذبات مری عقل پہ غالب آئے
ورنہ کیا کاغذی پھولوں میں ہے خوشبو ہوتی؟

کاغذی پھولوں میں ہوتی نہیں خوشبو لیکن
آدمی چاہے تو پتھر سے نکالے پانی
کھود کر لائے ستاروں کی زمیں سے مٹّی
چھین لائے مہ و خورشید سے ضو افشانی

کاغذی پھولوں سے آنے لگے خوشبو یکسر
اُن کی نکہت سے مہک اُٹھے دلوں کی بغیا
عزمِ انساں کے لئے کچھ بھی نہیں ناممکن
وہ جو کرنے پہ اُتر آئے تو سب کچھ ہوگا

غیرتِ لالہ وگل ہوں گے یہ کاغذ کے پھول
جب نکھر آئے گا رنگ اُن کا خلوصِ دل سے
اُنس و اُلفت سے مہک جائے گی پتّی پتّی
اُن کو جھولے ہیں جھُلائیں گے صبا کے جھونکے

رُوح پھونکے گی نئی نکہتِ فردوس اُن میں
اور لہرائیں گے خوشبو کے سمن پر پرچم
ناچ اُٹھیں گی فضاؤں میں خوشی کی پریاں
لطف و رحمت کی گھٹا برسے گی طالبؔ چھم چھم

۲۴ر فروری ۷۰ ۱۹ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

سَبیل

بیجُو گرمیں نے لگائی ہے خونِ دل کی سبیل
یہ خونِ دل ہے مرا، خونِ آرزو تو نہیں
یہ ذوق و شوق پیو، چیز ہے یہ پینے کی
لہو غریب کا ہے، آپ کا لہو تو نہیں!

(طالب چکوالی)

چھبیس ۲۶ جنوری (۱۹۷۱ء)

چھبیس ۲۶ جنوری ہے — دلّی دُلھن بنی ہے
سڑکیں ہیں جگمگاتی — پیڑوں میں روشنی ہے
رنگین قمقموں سے — قوسِ قزح سجی ہے
چھبیس ۲۶ جنوری ہے

فردوس کا نمونہ — دھرتی بنی ہوئی ہے
چھبیس ۲۶ جنوری کا — دل لے کے سانا آیا
جس کو ترس رہے تھے — وہ چیز ساتھ لایا
جنتا کے نام ہی پر — ہم نے ودھان پایا
بھارت خوشی سے ناچا — جنتا نے گیت گایا
چھبیس ۲۶ جنوری ہے!

آئین کو بدلنا — آسان تو نہیں ہے
لیکن کسی کا اس میں — ایمان تو نہیں ہے
یہ وید تو نہیں ہے — قرآن تو نہیں ہے
ہو نقص سے مبرّا
بھگوان تو نہیں ہے
چھبیس ۲۶ جنوری ہے!

اس میں ہیں جو نقائص — اُن کو نکال دیجئے
آئے نظر جو خامی — خوبی میں ڈھال دیجئے
خونِ جگر سے اُس کو — رنگِ کمال دیجئے
آوازِ عہدِ نو کو — سُر اور تال دیجئے

چھبیس (۲۶) جنوری ہے!

چھبیس (۲۶) جنوری کا — کیا شاندار دن ہے
یہ دن وِدھان کا ہے — یہ پُر وقار دن ہے
یہ عزمِ نو کی ساعت — یہ سازگار دن ہے
یہ انقلابِ نو کا — آئینہ دار دن ہے

چھبیس جنوری ہے!

شایانِ شان اس کے — باندھو نئے ارادے
پھینکو کہن قبائیں — پہنو نئے لبادے
عہدِ کہن کی باتیں — "شاہ اور شاہزادے"
دُنیا نے تو بھلا دیں — بھارت بھی اب بھلا دے

چھبیس (۲۶) جنوری ہے!

اُن کو بھلا کے طالب — دُنیا نئی بسائیں
امکانِ زندگی کے — جلوے نئے دکھائیں
سُکھ اور شانتی کے — غنچے نئے کھلائیں
سازِ حیاتِ نو پر — گانے خوشی کے گائیں ... چھبیس (۲۶) ....

نئی دہلی ۱۴ جنوری ۱۹۵۱ء — ("ملاپ" نئی دہلی)

انتظار

چمن میں بڑے پنج پر بیٹھ کر　　خدا جانے رہ کس کی تکتا تھا وہ
نجانے اُسے کس کا تھا انتظار　　نہ کہتا تھا کچھ اور نہ تھکتا تھا وہ

کسی نے کیا ہوگا وعدہ، مگر　　وہ آئی نہیں یا نہیں آسکی
مگر وہ تو پابند تھا قول کا　　وفا اس کے اجزائے فطرت میں تھی

بالآخر وہ آہی گئی ایک دن　　ریاضِ تمنّا میں آئی بہار
بتائیں گئی اپنی مجبوریاں　　بصد شوق اُس سے ہوئی ہمکنار

ملے جیسے پھولوں سے بادِ صبا　　سمندر کے پانی سے گنگا کا جل
میسّر ہوا حاصلِ انتظار　　اُسے مل گیا اپنی محنت کا پھل

وہ دونوں نجانے کہاں چل دیے　　اُفق سے کہیں دُور، دُنیا سے دُور
فضاؤں نے اُن کا سواگت کیا　　نچھاور کیا چاند تاروں نے نور

کسی نے کبھی پھر نہ دیکھا اُسے　　نگاہیں بھٹکتی رہیں چار سُو
وہ گھُل مل گیا اپنے محبوب سے　　وفا کا پجاری ہوا سرخرو

بہت لوگ کہتے تھے "وہ مر گیا"　　مگر کُفر کے ہم تو قائل نہیں
اُسے اپنے دلبر نے اپنا لیا　　اُسے لے گئی ساتھ اپنے کہیں

بُھلا دو اُسے ہمدمو! ساتھیو!
اُسے یاد احباب آتی نہیں
وہ دُنیا کی باتوں سے ہے بے نیاز
اُسے فکرِ دُنیا ستاتی نہیں

نئی دہلی ۴ر فروری ۷۱ء

اُڑان

مرے پروں کا ہوا میں نشان نہیں باقی
مگر میں خوش ہوں کہ اچھی رہی اُڑان مری
اسی سرور کا احساس ہے مجھے کافی
اسی سُرور سے پروانہ ہے جوان مری

(طالب چکوالی)

ایک خط

(ملیالم کی ایک نظم کا ترجمہ۔ برائے آل انڈیا ریڈیو)

خیر و عافیت سے ہو؟ سب ٹھیک ہے؟ میرے مونس، میرے ہمدم، میرے یار
ان کی خدمت میں مرا "آداب عرض" جو ہیں تیرے ہم خیال و رازدار

کوئی دن ایسا نہیں جاتا کبھی جب نہ آتی ہو مجھے بچوں کی یاد
جانتے ہو میرے تو بچے نہیں جن کو چوموں پیار سے اور دل ہو شاد

جانتے ہو تم کہ میں ڈرپوک ہوں اور بچپن سے مرا کائر ہے دل
مارتا رہتا ہوں من کو ہر گھڑی ہوں شکوک اور وہموں سے مضمحل

اب تو بالوں پہ سفیدی آ گئی رہ گئی میعادِ فرصت بھی قلیل
کون دیکھے میرے دل کا مد و جزر کون جانچے غم زدہ دل کی دلیل

خوشنما ہو تار رشتہ، یا آسرا کیا نہیں درکار مجھ کو میرے یار
اک حسینہ میری ٹوٹی ناؤ کو بحرِ اشکِ غم سے جو لے جائے پار

جانے کیا بھگوان کو منظور ہے کون جانے رازداں کے دل کی بات
کیا کہیں وہ کون ہوگی خوش نصیب جو سجائے گی مری بزم حیات

مجھ کو ہے وشواس اور بے حد یقیں دیکھ کر شادی شدہ، مجھ کو بہشتی
اپنی رحمت کی گھٹا برسائیں گے اور نئی ہوگی فضائیں روشنی

جب رہیں گے ہم اکٹھے دیوتا پھول برسائیں گے فرشِ خاک پر
اور بجاتے وینا نارد آئیں گے ناچ اُٹھے گی خوشی افلاک پر

آب رحمت ابرسائیں گے خوب ہوگا پہلے سے بہت بڑھ کر اناج
ہوگی جنتا شوق سے مصروف جشن مست احساسِ مسرت سے سماج

سر بسر معنی نظر آئیں گے لفظ معنی و مفہوم لفظوں سے عیاں
ہوگا مہمل لفظ بھی معنی بدوش زندگی ہوگی حیات کامراں

نئی دہلی ۶ مئی ۔ ۱۹۷۱ء (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

دین و ایمان کا لہو

ننگِ انساں پی رہا ہے ابنِ انساں کا لہو — جنسِ بے قیمت ہوا ہے عہد و پیماں کا لہو
بن کے دریا بہہ رہا ہے دین و ایماں کا لہو — "ہو گیا مانندِ آبِ ارزاں مسلماں کا لہو"

آدمی نے آدمی کا خون سستا کر دیا — بے ضرر معصوم بچّوں کا صفایا کر دیا
از سرِ نَو کربلا سا حشر پیدا کر دیا — مَل لیا دھرتی نے مُنہ پر مردِ میداں کا لہو

پٹ رہی ہے ہٹلر و چنگیز کی خونی لکیر — بے تحاشہ کٹ رہے ہیں مرد و زن برنا و پیر
ظُلم کی تاریخ میں ملتی نہیں اس کی نظیر — باغباں نے پی لیا اہلِ گلستاں کا لہو

بن گیا ہے مشرقی بنگال بنگلہ دیش اب
اس حقیقت کو چُھپا سکتے نہیں غیض و غضب
رائے سے جمہور کی انکار ہو سکتا ہے کب
ہے عیاں رنگِ شفق سے مہرِ تاباں کا لہو

---

۱۲ ستمبر - ۱۹۷۱ء — (برائے پی۔ بی۔ آئی)

لال قلعہ میں

(اپنے فرزندار جمند لفٹیننٹ کرنل ایس۔ کے کپور جو ان دنوں لال قلعہ میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ مقیم تھے، کے بلانے پر مجھے لال قلعہ میں رہنے کا شرف حاصل ہوا تھا انہی دنوں میں یہ اشعار لکھے گئے۔ طالب)

جب لال قلعہ میں کچھ دن آکر رہنے کا پیغام ملا
دل جھوم اُٹھا کر نورِ نظر کے ہاتھ سے پیار کا جام ملا
بھگوان کی جو اِچھا ہوتی ہے اُس کا سبب بنجاتا ہے
اُس کا کارن بننے کے لیے، خود من ہم کو اکساتا ہے
دل بن جاتا ہے گہوارہ جذباتِ شوق و تمنا کا
اور ذہن کو روشن کرتا ہے ایثار و عقیدت کا جذبہ
جذباتِ محبت کو احساسِ فرض بلاوا دیتا ہے
جب شوق تقاضا کرتا ہے تو پیار بلائیں لیتا ہے
دل کی خاموش فضاؤں میں پرشوق دعائیں پلتی ہیں
چپکے چپکے تکمیل کے سانچوں میں آشائیں ڈھلتی ہیں

تب دل کی کشش انساں کو کوسوں دُور سے کھینچ کے لاتی ہے
اور ریگ یگ پر منزل کی دوری آس کے گیت سناتی ہے
دھندلی دھندلی تصویروں کے پھر رنگ نکھرنے لگتے ہیں
گہری خاموشی کے لب سے پھر گیت بکھرنے لگتے ہیں
پھر اگلے وقتوں کی یادیں جادو کا کھیل دکھاتی ہیں
اور روپ انوپ کی پرتیمائیں پھر سے زندہ ہو جاتی ہیں
مینا بازار میں دیکھو تو کیا کیا مہ پارے آئے ہیں
یہ عرش سے حوریں اُتری ہیں یا چاند ستارے آئے ہیں
وہ ذوق، ظفر، غالب آئے وہ بزمِ سخن مسرور ہوئی
کیا شعر و سخن کا جادو ہے، ہر کلفت دل سے دور ہوئی
اس ذوقِ سخن اور دورِ فراغت کی قیمت آزادی تھی
یہ عیش و طرب کی محفل کیا تھی، تمہیدِ بربادی تھی
یہ دورِ فراغت اپنی جیب میں دورِ غلامی لایا تھا
یہ بھول تھی اپنی، دو دن بھی کیوں اس سے جی بہلایا تھا
ہر بھول کی قیمت ہر صورت انساں کو چکانی پڑتی ہے
لاش اپنی انا کی اپنے ہی کندھوں پہ اٹھانی پڑتی ہے
اک پل میں سندر سپنوں کے سب شیش محل ڈھ جاتے ہیں
آتی ہے باڑھ حوادث کی تو پریم نگر بہہ جاتے ہیں
پھر ٹھوس حقیقت خواب سے متوالوں کے ٹکراتی ہے پھر تلخیٔ دوراں طالبِ مجبور کے لب سی دیتی ہے
لال قلعہ دہلی [illegible]

سردار پٹیل (شردھانجلی)

جنم دن آج اُس سردار کا ہے
جسے خالق نے دی تھی سرفرازی
بنایا تھا جسے معمارِ ملّت
عطا جس کو کیا کردارِ غازی

طبیعت میں بلا کی سادگی تھی
غضب کی زود فہمی نکتہ دانی
عیاں تھی اُس پہ ہر رمزِ سیاست
تدبّر میں نہیں رکھتا تھا ثانی

رموزِ سلطنت کا تھا وہ ماہر
مُدبّر، کارساز و منتظم تھا
نظر رکھتا تھا رفتارِ زماں پر
مبصّر، مصلحت داں منصرم تھا

پروئے بکھرے موتی اک لڑی میں
کئے یک جا یہ اجزائے پریشاں
انھیں یک جہتی ملت عطا کی
بنے ذرّات مل کر مہرِ تاباں!

زہے قسمت، زہے عقدہ کشائی
گیا ہر وار بدبینوں کا خالی
ہوئی ناکام ہر اک چال اُن کی
نہ آئی کام اُن کے بدخصالی!

جھکا جاتا ہے سر بہرِ عقیدت
ہوئی جاتی ہیں فرشِ رہ نگاہیں
بنا ہے مشعلِ رہ اُس کا کردار
نہ کیوں پُر نور ہوں بھارت کی راہیں

بُلاوا دے رہی ہے اُس کی ہمت
بڑھاوا دے رہا ہے عزم اُس کا
بڑھی آتی ہے منزل سوئے رہرو
کہ طالب ہو رہا ہے جادہ پیما

نئی دہلی ۱۰۔۳۱؍اکتوبر ۱۹۷۱ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

گولڈن جبلی

(اپنی شادی کی پچاسویں سالگرہ کی تقریب)

(30-11-71)

پچاس سال ہوئے ہیں ہماری شادی کو — یہی تھی ماہ نومبر کی آخری تاریخ

بنے تھے دولہا دلہن ہم سجی تھی اپنی برات — ہمارے عقدِ مبارک کی تھی یہی تاریخ

یہی وہ دن تھا کہ احکامِ ایزدی سے ہم — بندھے تھے ایک مقدس اٹوٹ بندھن میں

رہِ حیات کے ساتھی بنے تھے ہم دونو — بھرے تھے پھول محبت کے اپنے دامن میں

نیا سفر تھا نئے شوق کے تقاضے تھے — نئی اُمید کے پھولوں سے سج رہی تھی فضا

بُلا رہی تھیں اشاروں سے زیست کی راہیں — اُفق سے جھانک رہی تھی حیاتِ نو کی فضا

خدا کا شکر ہے ہر رنگ میں رہے ہمرہ — خدا کا شکر ہے ہم راہ میں نہیں بھٹکے

خدا کا شکر ہے کافی سفر تمام ہوا — خدا کا شکر ہے ہر وقت ساتھ رہے

نہیں یہ بات کہ راہیں رہیں سدا ہموار — نہیں یہ بات فضائیں رہیں سدا گل رنگ

نہیں یہ بات کہ باہم نہیں ہوئی تکرار — نہیں یہ بات سدا ہم رہے ہیں ہم آہنگ

پچاس سال کی یادوں کا رُتقا ہے — کہ ہم منائیں بصد شوق گولڈن جبلی
خدا کا شکر کریں اُس کی نعمتوں کے لئے — کٹی ہے خوب بہار و خزاں کی نصف صدی

بجا کہ فرض کا احساس بھی غنیمت ہے — ادائے فرض ہے لیکن بہت بڑی دولت ہے
خدا کرے کہ یہ دولت نصیب ہو سب کو — وہ خوش نصیب ہے جو کر سکے کوئی خدمت

ادائے فرض میں کی زندگی بسر ہم نے
ادائے فرض سے یارب کبھی کریں نہ فرار
ہمارا اُس کا رہے ساتھ تا دمِ آخر
اسی کے فیض سے ہے باغِ زندگی میں بہار

یہی دُعا ہے، یہی التجا، یہی خواہش
ہم اپنے فرض سے ہرگز نہ اجتناب کریں
رہِ صداقت و حق پہ ہوں گامزن طالب
غلط روی سے نہ دُنیا و دیں خراب کریں!

نئی دہلی - ۲۵، نومبر ۷۱ء

گمنام ویر کو پرنام

تجھ کو سو پرنام اے گمنام ویر! — تیری قربانی ہے سچ مچ بے نظیر!
کوئی تیرے نام سے واقف نہیں — کوئی تیرے کام سے واقف نہیں
ہے ترا ایثار نادر، بے مثال — اپنی بھارتی کو بنایا تو نے ڈھال
دشمنوں کے وار سینے پر سہے — تیرے تن سے خون کے دریا بہے!
جان دے کر فرض پورا کر دیا — نام بھارت ورش کا اونچا کیا
نام کی، انعام کی پروا نہ کی — دیش کی رکھشا میں اپنی جان دی
کھیل سمجھا کھیل جانا جان پر — قوم کی خاطر کٹایا اپنا سر
تیری لاثانی شہادت ہے امر — تو ہوا قربان حق و انصاف پر!
تو نے اپنے دیش کی بنیاد کو — اک سنہرے خواب کی روداد کو

ق

پختگی فولاد کی کر دی عطا — تیرے خوں سے اک نیا پودا اُگا!
اک نئی تہذیب نے پایا جنم — اک نیا خورشید ابھرا یک قلم

ظلمتِ شب میں اُجالا ہو گیا
ہندیوں کا بول بالا ہو گیا

جو ترے خوں سے اَمر جیوتی جلی — تا ابد دیتی رہے گی روشنی!

یہ "اَمر جیوتی سَدا جلتی رہے   لیں ہدایت اس سے اپنے منچلے!

ہو تمہارا کردار اپنا رَہ نما

ہوں ترے پیرو ہمارے سُورما

ہم ترا احساں چُکا سکتے نہیں

خون کی قیمت لگا سکتے نہیں!

کرتے ہیں پرنام تجھ کو لاکھ بار

مادرِ ہندوستاں کے جاں نثار

زندہ باد! اے قوم کے گمنام شیر!

زندہ باد! اے صف شکن مردِ دلیر!

زندہ باد اے سرفروشی کے نشاں

زندہ باد اے دیش بھارت کے جواں!

یہ ریاضِ قلبِ طالبؔ کے ہیں پھول

اے شہیدِ ملک و ملّت کر قبول!

نئی دہلی
۲۴ر جولائی ۷۲ء

سالنامہ "بینک سماچار" نئی دہلی

خشتِ بنیاد

خشتِ بنیاد کو کیا نام و نمو سے مطلب
خشتِ بنیاد کو مٹی میں دبا رہنے دو
اس کی قسمت میں نہیں جہرِ نمائش کی ضیا
اُس کو ظلمات کی چادر سے ڈھکا رہنے دو

اُس کے کندھے ہیں اُٹھائے ہوئے لاکھوں من بوجھ
اُس کے شانے ہیں سہارے ہوئے قصر و مینار
اُس کے آغوش میں سوتی ہیں کئی تہذیبیں
اُس کا دامن ہے سمیٹے ہوئے گنجِ اسرار

قطب مینار کا گنبد ہو کہ ایفل ٹاور
سر اُٹھائے ہے رعونت سے ہے جیسے نازی
کس کے بل بوتے پہ قائم ہے اسے کیا معلوم
سر بہ افلاک عمارات کی سر افرازی

وقت کا ہاتھ جھکا دیتا ہے سرکش کا سر
ایک تھپیڑے سے نکل جاتے ہیں سارے دم خم
منہ کے بل خاک پہ گر پڑتے ہیں کاخِ شاہی
اُن کی بنیاد مگر رہتی ہے پھر بھی محکم

خاک ہو جاتے ہیں جب شیش محل شہرت کے
ڈھیر ہو جاتے ہیں جب نام و نمو کے شہکار
قصر و مینار کا جب ملتا نہیں کوئی نشاں
خشتِ بنیاد ہی بنتی ہے نشان و آثار

لاکھ خاموش ہے یہ شاہد عہدِ ماضی
وقت پڑنے پہ مگر راز بتا دیتی ہے
اِس کی ہر بات سے ملتا ہے عہدِ رفتہ کا ثبوت
اس کی ہر بات حقیقت کا پتا دیتی ہے

آئینہ ہوتا ہے جب اس کا نظامِ ہستی
آنکھ والوں کو نظر آتا ہے اس کا ایثار
نہ ستائش کی تمنا نہ جنونِ شہرت
خشتِ بنیاد کا طالب ہے مثالی کردار

نئی دہلی ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء
(رہنمائے تعلیم، دہلی)

ڈیوک کاونڈسر کی وفات کی خبر سن کر

ونڈسر کا ڈیوک، عشق و محبت کا تاجدار — کہتے ہیں لوگ آج جہاں سے گذر گیا
اب ریڈیو کی بات پہ کس کو ہو اعتبار — وہ ہو گیا امر تو یہ کہتا ہے "مر گیا"

تھا بیسویں صدی میں وہ مجنوں کا جانشیں — سمسن کا حسنِ فکر ہوا لیلئے جمال!
بخشی جنوں کو حکمت و دانش کی مملکت — سود و زیاں کی فکر ہوئی خامئی خیال!

ٹھکرا کے سلطنت کو بنا شہریارِ عشق — اس عہدِ زر پرست میں قیمت دی پیار کو
چھتیس[۳۶] سال پریم کے جھولوں میں جھول کر — اب جا رہا ہے حسنِ ازل کے دیار کو!

کس نے کہا کہ ختم ہوئی اس کی زندگی — کس نے کہا کہ مردِ وفادار مر گیا
کس نے کہا کہ شوق کی دنیا اجڑ گئی — کس نے کہا کہ پیکرِ ایثار مر گیا!

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

نئی دہلی۔ ۲۹، مئی ۱۹۷۲ء

آزادی کی سلور جوبلی

ہم نے پہلی بار جب دیکھا اُسے ہو گئے اُس بات کو پچیس سال
طفلکِ کم سن تھی آزادی مگر کم سنی میں بھی تھا کیا اُس کا جلال!
کہہ رہی تھی اُس کی تابندہ جبیں اُس کا مستقبل ہے روشن تر ز حال
خیر سے اب ہو گئی ہے وہ جواں اور نکھر آئے ہیں اُس کے خدّ و خال
جا بجا چرچا ہے اُس کے حُسن کا چودھویں کا چاند ہے اُس کا جمال
ایک عالم دیکھ کر ہے دم بخود اُس کا رعبِ حُسن، اُس کی چال ڈھال
جل رہے ہیں دل ہی دل میں وہ حریف جو سمجھتے تھے "تمہیں ماتا کا مال"
اُن کی کوشش ہے نہ بڑھنے پائیں ہم اُن کی خواہش ہے رہیں ہم خستہ حال
بوالہوس ہیں، خود غرض ہیں، کم نظر کیا مفادِ قوم کا اُن کو خیال
بیچ دیتے ہیں مفادِ قوم کو یہ بھی ہے اُن کے لیے بکری کا مال!
ہم کو لے ڈوبے گی اُن کی زیرکی سانپ یہ روباہ کی چلتے ہیں چال!
دیش بھگتی کا بھی ہے دعویٰ انھیں دشمنوں سے بھی ہیں محوِ قیل و قال
اس لیے لازم ہے ہم چوکس رہیں کارگر ہونے نہ دیں غیروں کی چال

اصلِ ایماں ہے حفاظت دیش کی
ہم بھی طالب آپ کے ہیں ہم خیال

نئی دہلی ۔ ۲۶ اگست ۱۹۷۲ء "رہنمائے تعلیم" دہلی

حضرت ابر احسنی کی اہلیہ محترمہ کی وفات

یہی ہے شومئ قسمت یہی انساں کی مجبوری
اسی کا نام ہے تقدیر کا بن کر بگڑ جانا
بہت نزدیک سے جب آخری منزل بلاتی ہو
قیامت ہے کسی دیرینہ ساتھی کا بچھڑ جانا!

خدا توفیق و ہمت دے تو فرقت بھی گوارا ہو
مناسب بلکہ واجب ہے سرِ تسلیم خم کرنا
بچھڑ کر جانے والے پر نگاہ مہر ہو یارب
تقاضا ہے تری رحمت کا بندوں پہ کرم کرنا

عطا کر آبرؔ کو اُس کے سبھی خویش و اقارب کو
سکون و صبر و تسلیم و رضا کی شانِ غم کوشی
کہ یہ ناقابلِ برداشت صدمہ بھی سہا جائے
دُعائے نیرِ طالب ہے دوائے غم فراموشی!

نئی دہلی ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء
("رہنمائے تعلیم" دہلی)

ملن

۱۲ ار فروری ۱۹۷۳ء کی شام کو امبیسڈر ہوٹل نئی دہلی میں گورنمنٹ کالج لاہور کے اولڈ بوائز کا ایک شاندار (Get to 9 eTneh) ہوا جس میں چیف جسٹس آف انڈیا شری سیکری، جسٹس گروڑ وکلار وغیرہ مقتدر ہستیاں شامل ہوئیں۔ یہ نظم اس تقریب میں پڑھی گئی اور حاضرین کے موڈ کے مطابق ثابت ہوئی۔ (طالب)

سیاست کے پُر پیچ جھگڑوں کو چھوڑو
نہ آئین و قانون کی دُم مروڑو!
سُلگتی نہ بھڑکاؤ، رشتے نہ توڑو
شکستہ دلوں کو محبت سے جوڑو

سُنو تو سُنائیں تمھیں وہ کہانی
کہ وقتِ رواں بھول جائے روانی!
پلٹ آئیں ایّام عہدِ جوانی
طبیعت کو گرمائیں باتیں پُرانی

وہ ایام کالج کے دل کش نظارے
وہ اُٹھتی جوانی کے پُر کیف دھارے!
وہ بے فکر، آزاد ساتھی ہمارے
کہاں کھو گئے ہیں وہ سارے کے سارے

غنیمت ہیں دو چار پھول اُس چمن کے
غنیمت ہیں افراد بزمِ کہن کے
غنیمت ہیں ارباب اس انجمن کے
غنیمت ہیں جذبات باہم ملن کے

مُبارک ہے پھر ہم خیالوں کا مِلنا
مُبارک ہے پھر دیکھے بھالوں کا مِلنا
اُسی باغ کے نونہالوں کا مِلنا
اُسی ماں کی گودی کے پالوں کا مِلنا

ملن کا یہ منظر ہے کتنا سُہانا
جسے غیر سمجھے تھے نکلا یگانا
حقیقت ہے طالب بہ رنگِ فسانا
الٰہی اسے چشمِ بد سے بچانا!

نئی دہلی ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء
(رہنمائے تعلیم، دہلی)

گایتری، مہامنتر (کے آدھار پر)

اے پربھو تو سرو شکتیمان ہے — تیج تیرا مہر و مہ کی شان ہے
سب کا رکھشک اور پالن ہار تو — وشو کا آدھار اس کا پران تو
گیان اور بدھی عطا کرتا ہے تو — تیرے بل سے آتما بلوان ہے
تو بچاتا ہے ہمیں دکھ درد سے — ہر گھڑی تجھ کو ہمارا دھیان ہے
سکھ کی ورشا رات دن کرتا ہے تو — کس قدر ہم پر ترا احسان ہے
تیرے سندر روپ پہ موہت ہیں ہم — تجھ کو اپنا لوں یہی ارمان ہے!
دل میں تیری آرزو پیدا ہوئی — یہ بھی تیری دین تیرا دان ہے!
اپنی سیوا کا مجھے سو بھاگیہ دے — میں ہوں نردھن اور تو دھنوان ہے
میں نے خود کو تیرے ارپن کر دیا — بھاونا کی اور کیا پہچان ہے!
ہدیہ ناچیز ہے کر لے قبول — اس میں تیری شان میرا مان ہے
اپنی رہ پہ ڈال میری عقل کو — یہ بچاری مفت میں حیران ہے
ٹھیک ہو بدھی تو سب کچھ ٹھیک ہے — ورنہ یہ انسان ہی حیوان ہے

تیری جانب ہو مری بدھی کا رخ
مانگتا طالب یہی وردان ہے!

نئی دہلی۔ ۱۳ اپریل ۱۹۷۳ء — ڈائریکٹر تعلیم دہلی "ریٹائرڈ" (دہلی)

پرانا تماشہ

بہت دیر سے جس کے تھے منتظر
بالآخر وہ آئی نوید بہار
تمنا کے دل کی کلی کھِل گئی
تصوّر کے پھولوں پہ آیا نکھار

ملے جب چمن میں گل و عندلیب
مِلن کا پرانا تماشہ ہوا
مگر اس تماشے میں تھا وہ فسوں
کہ ہر نقش احساسِ نغمہ ہوا

فضاؤں میں رعنائیاں بس گئیں
حسیں آرزوؤں کے غنچے کھِلے
اُمیدوں کی زنگیں دُھنک سج گئی
جہاں بھی محبت سے دو دل ملے!

فرائض سے انکار کرنا غلط
فرائض کا اقرار کرنا بجا
رواداری باہمی خوب ہے
خطا پوش ہوتی ہے چشمِ وفا!

خلوص و محبت سی دولت کہاں
یہی چیز ہے حاصلِ زندگی
بنالو اسے حرزِ جاں اے عزیز
کہ مشکل مسائل کا حل ہے یہی!

نئی دہلی ۔ ۲۵ جون ۱۹۷۳ء
"دلشاد یانہ"

خیالوں کی لڑائی

خدا معلوم یہ کیا ماجرا ہے
جو پختہ بال ہیں تو دل ہے کچا
نہیں پہچانتا کھوٹے کھرے کو
سمجھ لیتا ہے جھوٹے کو بھی سچا

اسے معلوم کیا باتوں کی گھاتیں
نہ اس کو یہ خبر ہے مصلحت کیا
ہے کیا تہہ داریوں کا رازِ پنہاں
ہے ظاہرداریوں کی اصلیت کیا

کبھی تھی راستگوئی جزوِ ایماں
مگر اب بے وقوفی کا نشاں ہے
دروغِ مصلحت آمیز کی جے
صداقت شمعِ کشتہ کا دھواں ہے!

بنامِ مصلحت سب کچھ رَوا ہے
ریاکاری بنی ہے ہوشیاری
ہر اک چہرے پہ ہے اک اور چہرہ
ہیں یہ بہروپیے یا راس دھاری!

غضب تو یہ کہ بدلے چاند تارے
مگر بدلی نہیں انساں کی فطرت
وہی زر۔ زن۔ زمیں کا ہے بکھیڑا
وہی طاقت کے پنجے میں صداقت!

وہی اپنا بنانے کی ہر اسکیم
وہی لڑنے لڑانے کے بہانے
وہی سازش نوازش اور بغاوت
وہی زور اور زر کے تازیانے!

وہی دانش وروں کی خود سری
وہی اہلِ ہنر کی خود نمائی!
وہی بر خود غلط فہمیوں کی ٹکر
وہی طالب خیالوں کی لڑائی!

نئی دہلی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۷۳ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

کردارِ ہستی

بہت پُر شور ہے بازارِ ہستی — بہت شہ زور ہے رہوارِ ہستی
کسی بھی زاویے سے اس کو دیکھو — بہت دل چسپ ہے کردارِ ہستی!

کبھی ہے اس میں طوفانوں کی تُندی — کبھی خاموش دریا کی روانی
کبھی چندا کی کومل چاندنی ہے — کبھی کشمیر کے چشموں کا پانی

کبھی لگتا ہے اس سے بھر گیا جی — مناسب ہے اب اس کا ساتھ چھوڑوں
بُھلا دوں عہدِ رفتہ کے فسانے — روایت کی کڑی زنجیر توڑوں!

کبھی کہتا ہوں مجھ سے یہ نہ ہوگا — نہیں یہ میری فطرت کو گوارا
محبت کی نوازش بھول جاؤں — کروں یادوں کی دُنیا سے کنارا

نہیں میرے لئے لاکب یہ ممکن
کہ اپنے آپ ہی کو بھول جاؤں
سمجھ لوں شخصیت میری الگ ہے
میں آئینے میں کس کو مُنہ دکھاؤں!

نئی دلی ۲۸ر جولائی ۱۹۷۳ء

خموشی

خموشی فکر و فن کی انتہا معلوم ہوتی ہے
شبستانِ تخیّل کا دِیا معلوم ہوتی ہے
کسی بدبخت شاعر کی انا کی آخری ہچکی
شکستِ شیشۂ دل کی صدا معلوم ہوتی ہے

مصیبت کی گھڑی میں آسرا معلوم ہوتی ہے
مریضِ کشتۂ غم کی دوا معلوم ہوتی ہے
سمجھتی ہے سبھی کچھ دیکھتی ہے کچھ نہیں کہتی
خدا رکھے، حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے

کبھی انکار کا تیرِ قضا معلوم ہوتی ہے
کبھی اقرار کی دل کش ادا معلوم ہوتی ہے
"خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمے آید"
خدا معلوم کیا ہے اور کیا معلوم ہوتی ہے

نقائص کو دبا دیتی ہے مثلِ شفقتِ مادر
جرائم کو چھپا لیتی ہے یارِ با وفا بن کر
سبھی کمزوریوں اور خامیوں کو ڈھانپ لیتی ہے
غمِ مجبور سو جاتا ہے بے غم تان کر چادر!

اسی سے ہے بھرم قائم مصیبت آشناؤں کا
یہی پردہ ہے مجبور دل شریفوں بے نواؤں کا
اسی کے فیض سے عیب و ہنر کھلنے نہیں پاتے
اسی میں راز پنہاں ہے جفا پرور وفاؤں کا

یہی مسکان بن کر دیوتا کے لب پہ آتی ہے
یہی صبر و قناعت کے حسیں نغمے سناتی ہے
یہی تمہید بنتی ہے محبت کے فسانے کی
یہی تصویرِ نفرت بن کے طائب منہ چڑاتی ہے

○

نئی دہلی ۲ ستمبر ۱۹۷۴ء   رہنمائے تعلیم دہلی

احساسِ شکر

اُس نے جو بخشی ہیں ہم کو نعمتیں — اُن کو اپنا حق بنا بیٹھے ہیں ہم
شکر کا احساس ہم تک ہوتا نہیں — اپنے داتا کو بھلا بیٹھے ہیں ہم!

ہم سمجھتے ہیں کہ ہیں ہم ہی خدا — ہم سے بڑھ کر دوسرا کوئی نہیں
عقل و دانش ہیں ہمارے زرخرید — سچ تو یہ ہم سے بڑا کوئی نہیں

ناسپاسی سا نہیں کوئی گناہ — ناسپاسی شیوۂ شیطان ہے
اس سے ہوجاتے ہیں ناقص فہم و دل — کفر بھی آتا نظر ایمان ہے!

شکر کے احساس سے عاری ہیں جو — راحتِ دل اُس کو مل سکتی نہیں
اس کو حاصل ہو نہیں سکتا سکوں — اس کی قسمت میں یہ خوش بختی نہیں

اس کی جاں لیوا ہے اس کی برہمی — دشمنِ جانِ حزیں ہے انتشار
مشتعل ہو خوں تو نیند آتی نہیں — مضمحل ہو دل تو کیا آئے قرار

جس کی تہ میں ہو غرض مندی نہاں — ایسی بھگتی میں کوئی شکتی نہیں
شکر سے ملتی ہے من کو شانتی — شکر سی طالب کوئی بھگتی نہیں

نئی دہلی ۲۴ ستمبر ۷۸ء — "دیگار مرز" دہلی اور رہنمائے تعلیم دہلی

سحابِ سخن حضرت آبرا حسنی کی یاد میں

(۷، اور ۸، نومبر کی درمیانی شب کو اپنے گھر میں سوتے میں آپ کو کسی نامعلوم شخص نے قتل کر دیا۔)

لو ایک اور صاحبِ علم و ہُنر گئے
نباضِ فنِ شعر، حقیقت نگر گئے

اُردو کے غمگسار گئے چارہ گر گئے
اِس جاں بلب مریض کو بیجان کر گئے

وہ کیا گئے کہ رونقِ بزمِ سخن گئی
لطفِ زبان، فصاحت و حُسنِ نظر گئے

جیسے گُلِ بہار سے خوشبو ہوا ہوئی
جیسے مزاجِ شعر سے کیف و اثر گئے

اَب کون داد دے گا بیانِ خیال کی
منصف مزاج ناقدِ عیب و ہُنر گئے

مشہور تھے سحابِ سخن آبرا حسنی
وہ ماہرِ عروض وہ بالغ نظر گئے

شاگرد سینکڑوں تھے مگر بیشتر ہیں گم
خیرات بٹ گئی تو گدا اپنے گھر گئے

رکھے تھے میں نے دل میں جو آنسو سنبھال کر
آنکھوں کے ہاتھ آئے تو گر کر بکھر گئے

اب کیا کہوں کہ میں نے قسم اپنی توڑ دی
یا خود بخود یہ پھول کھلے، اور بکھر گئے

روشن کئے ہیں ذہن نے یادوں کے سو چراغ
جب روشنی ہوئی تو اندھیرے سنور گئے

اقدارِ زندگی جو کبھی تھیں کہاں گئیں
ہم اُن کو ڈھونڈنے کے لئے دربدر گئے

اب کوئی ہم خیال کوئی ہم نظر نہیں
کیا سب ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے؟

لمحاتِ خوش گوار بھی طالب گئے اُدھر
لمحاتِ خوش گوار کے ساتھی جدھر گئے

نئی دہلی - ۱۹، نومبر ۱۹۷۴ء

دُعائے خیر

داتا! تری غریب نوازی ہے لاجواب — لوٹی ہے تیرے در سے دُعا میری کامیاب

لائی ہے چُن کے پھول اُمیدوں کے باغ سے — یہ پھول ہیں کہ پیار کے ہنستے ہوئے گلاب

اَب شکر کے سوا کوئی احساس ہی نہیں — تُو نے پلائی مجھ کو مسرّت کی وہ شراب

تُو نے چڑھائے پھول مرے دل کی بات پر — تُو نے کیا ہے مجھ پہ کرم اپنا بے حساب

مَن موہنے کی تُو نے نکالی نئی سبیل — بخشا نگاہِ شوق کو اندازِ انتخاب

تکمیلِ آرزو سے ہُوا باغ باغ دل — دُنیائے پُربہار کے آنے لگے ہیں خواب

گلزارِ انبساط میں کھِلنے لگے ہیں پھول — بارِ رحمتِ کریم کا وا ہوگیا ہے باب

میری دُعا کے ساتھ خوشی ناچنے لگی — نغماتِ دل نواز کا بجنے لگا رباب

دل چسپ و دل فریب ہے اس کا ورق ورق — ہے زندگی بھی فرض و محبت کی اک کتاب

طالبؔ مری دُعا میں ہے خوشبو خلوص کی

ہے قابلِ قبول مہکتا ہوا گلاب

ڈیرہ دون ۲۹، اکتوبر ۱۹۷۵ء

ولادت آریہ سماج کا
جشنِ صد سالہ
(منعقدہ ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء)

سَو برس ہاں سَو برس پہلے کی بات
آ گئی ہے خود بخود ہونٹوں پہ آج

تھا یہی اپریل کی بارہ کا دن
بمبئی میں جب ہوا قائم سماج

سوامی جی نے خود لگایا تھا یہ پیڑ[1]
اور کیا تجویز نام "آریہ سماج"

رفتہ رفتہ بن گیا یہ وہ شجر
جس کا سایہ ہے تپِ غم کا علاج

ایسا جو پودا لگا پنجاب میں
سب سے بڑھ کر وہ پھلا پھولا وہاں

اُس نے کایا ہی پلٹ دی دیش کی
بن گیا "بھارت" جو تھا "ہندوستاں"

کھل گئے کالج، گوروکل، مدرسے
علم سی شے کی فراوانی ہوئی

لڑکیوں کو بھی ملا پڑھنے کا حق
دُور نادانوں کی نادانی ہوئی

---

[1] سوامی دیانند جی سرسوتی۔

پھر عقیدت عقل کی سننے لگی — کام پھر کرنے لگے ذہن و دماغ
وید کا پرچار پھر ہونے لگا — پھر ترو تازہ ہوا وحدت کا باغ

ہم نے پہلی بار یہ نعرہ سنا — "ہو بُرا بھی تو بھلا ہے اپنا راج
حکمرانی غیر کی اچھی نہیں — غیر کے سر پہ ہو کیوں بھارت کا تاج"

اِس نئی تحریک سے حبِّ وطن — قوم کے افراد میں پیدا ہوا
آگ آزادی کی روشن ہو گئی — رفتہ رفتہ یہ شرر شعلہ ہوا

ہو گیا آزاد آخر اپنا دیش — خواب سوامی جی کا پورا ہو گیا
سب سے پہلے جس کی تھی یہ کلپنا — آج بھارت ورش ہے بھولا ہوا

سچ تو یہ ہے سب نے کی قربانیاں — ماں کی خاطر کٹ مرے اس کے سپوت
سب سے بڑھ کر آریوں نے دی بلی — ہیں ورق تاریخ کے اس کا ثبوت

کر دیا جو ہو سکا سو سال میں — اب نئے سو سال کی ہے ابتدا
عہدِ نو کی ہے چنوتی بھی نئی — مشکلیں تازہ تریں، چیلنج نیا

اس نئے چیلنج کو کرنا ہے قبول — پھر تری ہمت کا ہوگا امتحاں
گھورتا ہے دیو حرص و آز کا — دائمی اقدار کی لب پہ ہے جاں

جشنِ صد سالہ مبارک ہو تجھے — مہرشی کا تپ ہو تیرا رہنما
ہر برائی کو پچھاڑے تیرا عزم — ہر اندھیرے میں ہو تو روشن دیا

تیرا مسلک ہو ہر اک کی عافیت — خویش ہو یا غیر ہو سب کا بھلا
فیض پائیں سب تری تعلیم سے — ہوں ترے طالب حقیقت آشنا

نئی دہلی۔ ۲۲ اپریل ۱۹۷۵ء — (" ریفارمر " آریہ گزٹ وغیرہ)

○

سمجھ بوجھ ہو میری عالی نہاد — نہ بوئے تکبر نہ خوئے فساد
ہو ورد ختم تو ہو میسر کتاب — اور اک دوست ایسا ملے لاجواب

مرے ساتھ جو چپ کا پیالہ پیئے
جو کیفِ خموشی کے صدقے جیئے

نئی دہلی ۳۰ مئی ۱۹۷۵ء — (" رعنائے تعلیم " دہلی)

۷۵ واں جنم دن

ہو گئے پورے پچھتر سال آج — انتہا کی جب ہوئی تھی ابتدا

دن بہ دن گھٹنے لگی میعادِ زیست — رفتہ رفتہ میں بڑا ہوتا گیا

تھا بہت دلچسپ یہ دلکش سفر — تھی بہت من موہنی یہ یاترا

دھوپ میں بھی باغ کی دیکھی بہار — چاندنی میں بھی لیا اُس کا مزا

زندگی دیتی رہی مجھ کو فریب — میں فریبِ زندگی کھاتا رہا

منزلوں نے بارہا روکا مجھے — میں نہ دم لینے کو دم بھر بھی رُکا

دل تو کہتا ہے ابھی کچھ اور چل — جسم کہتا ہے "ہوں میں تھک سا گیا"

مجھ کو ایسے بھی ملے کچھ مہرباں — ناروا کو بھی جو سمجھے ہیں روا

دوستوں کے دل کی دل ہی میں رہی — دشمنوں نے جی میں جو آیا کہا

ہے بعید از فہم شاعر کا مزاج — وہ کبھی عاصی کبھی مردِ خدا

موڈ کا اک پیکرِ رنگیں ہے وہ — اُس کی دنیا ہے تماشہ موڈ کا

یہ تو اچھا ہے کہ اپنی نبھ گئی — مل گئی بیوی مجھے باحوصلہ

ورنہ ہم جیسوں سے نبھنا ہے کٹھن — جو نبھائے اُس کو کہئے مرحبا

ہے بزرگوں کی دعاؤں کا اثر
ورنہ طالب میں کسی قابل نہ تھا

نئی دہلی ۱۳ مئی ۷۵ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

شہنشاہِ شہیداں
سوامی شردھانند

اے نگہدارِ صداقت، اے نثارِ دیدِ پاک
تیری حق گوئی کا شہرہ، تیری جانبازی کی دھاک!

تُو نے تحریکِ گورو کُل کو بنایا کامیاب
تیری ہمّت اور نگاہ دُوربیں بھی لاجواب

جنگ آزادی میں تو سینہ سپر ہو کر لڑا
کام بھی تیرا بڑا تھا نام بھی تیرا بڑا

غیر مُسلم ہو کے بھی تُو زینتِ منبر[1] ہُوا
سرفرازی سے تری ہم سب کا اونچا سر ہُوا

نام شردھانند تھا تیرا تُو تھا مردِ جری
ہے سبق آموز تیرا شیوۂ مردانگی

---

[1] جامع مسجد دہلی میں تقریر

یاد ہے، تو تھا علیل اور درپئے دِہاں تھے سب
زندگی تیری بچانے کے لئے کوشاں تھے سب

تُو بزرگِ سِن رسیدہ تھا بہت بیمار تھا
قاتلِ سفّاک لیکن شاطر و عیّار تھا

پیاس قاتل کی بجھائی تُو نے اپنے خون سے
مانگ شُدھی کی سجائی تُو نے اپنے خون سے

تُو نے اپنے خون سے چہرہ نکھارا دھرم کا
تیرے دَم سے اور بھی چمکا ستارا دھرم کا

یہ حقیقت ہے کہ تھا کردار لاثانی ترا
رہتی دُنیا تک رہے گا نام اے سوامی ترا

جاں نثاری سے ملا تجھ کو شہادت کا مقام
اے شہنشاہِ شہیداں تجھ کو طالب کا سلام!

نئی دہلی ۳۰ جولائی ۱۹۷۵ء شردھانند (اردو شتابدی) بلیدان اسمک۔ ٹریفامر، دہلی

"ڈسپلن"

نیا احساس

اوصافِ ڈسپلن کا جو احساس ہوا ہے
سمجھو تو حکومت پہ ہُوا فضلِ خدا ہے
بے راہ روی اور تساہل ہیں وہ امراض
اکسیرِ ڈسپلن ہی فقط جن کی دوا ہے
ہر شعبۂ ہستی میں ہے تنظیم اسی سے
ہر طرزِ حکومت کا یہی رازِ بقا ہے

مفقود ڈسپلن ہو تو مفلوج حکومت
سچ ہے کہ ڈسپلن ہی حکومت کی بنا ہے
پابندیٔ اوقاتِ دفاتر بھی ہے لازم
نکتہ یہ اب اربابِ حکومت پہ کھلا ہے
رشوت بھی سفارش بھی تعصب بھی بُرے ہیں
فقدانِ ڈسپلن کا مگر سب سے بُرا ہے

لگتا ہے بدل جائے گی تصویرِ حکومت
حُکّام سے پھر نام ڈسپلن کا سُنا ہے

مے خانۂ جمہور کے ساقی! ترے صدقے
احساسِ فرائض کا نیا دَور چلا ہے

عاصل ہے یہی بھارتی تہذیب کا طالب
"کتنا بھی بُرا فرد ہو، ملک اُس سے بڑا ہے"

نئی دہلی ۱۰، اگست ۱۹۷۵ء (" آج کل" دہلی)

○

زندگی کرنا تو کچھ مُشکل نہیں
ہو اگر کچھ زندگی کا مُدّعا

(طالب)

شاعرِ گرِ عظیم

(دالبرا الفصاحت حضرت جوش ملسیانی نے ۲۷ جنوری ۷۶ء کو بعمر ۹۲ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا)
(در سسم کریا ۶ فروری ۷۶ء)

وہ بے نظیر ماہرِ فنِ عروضِ شعر — دریا بہائے جس نے فصاحت کے عمر بھر
بخشی زبانِ شعر کو جس نے نئی جلا — جس کی نظر نے حُسنِ بیاں کو دیا اثر

وہ باکمال شاعر و شاعر گرِ عظیم — جاری تمام عمر رہا جس کا فیضِ عام
اپنے چراغِ فن سے جلاتا رہا دیے — ذرّوں کو آفتاب بناتا رہا مدام

با وضع، پاک باطن و پرہیزگار تھا — سادھو کا تھا مزاج، تو پنڈت کا تھا دماغ
اُردو کو جس پہ ناز ہے، پنجاب کو ہے فخر — تھا جوشؔ جس کو کہتے ہیں سب جانشینِ داغؔ

وہ داغؔ کی زباں کا امیں جوشِ نکتہ داں — افسوس اپنی بزم سے اُٹھ کر چلا گیا
طاؔلب زبانِ حال سے کہتے ہیں فکر و فن — رحمت خدا کی اس پہ ہو، لاکھوں میں ایک تھا

نئی دہلی۔ ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

گلہائے عقیدت

کشتیٔ شعر و سخن کا ناخدا جاتا رہا

ایک نبّاضِ سخن، فن آشنا جاتا رہا
ملسیانی جوش سا نغمہ سرا جاتا رہا
جادۂ شعر و سخن کا رہ نما جاتا رہا
جو بتاتا تھا ہمیں اچھا بُرا جاتا رہا
اب کہاں پائیں گے ایسا ماہرِ فنِّ عروض
ہاتھ سے اپنے وہ دُرِّ بے بہا جاتا رہا
کُنجِ گُمنامی میں بھی جس کو ملا شہرت کا تاج
وہ دیارِ علم کا فرماں روا جاتا رہا
ہاتھ ملتے رہ گئے اہلِ نظر، اہلِ ہُنر
تشنگانِ ذوق کا حاجت روا جاتا رہا
کس کی اب پُوجا کریں گے ماہرانِ فکر و فن
ماہرانِ فکر و فن کا دیوتا جاتا رہا

کون گردابِ نقائص سے کریگا ہوشیار
واقفِ خطراتِ دریا ناخدا جاتا رہا

جو فقط شاعر نہ تھا، شاعر گر یکتا بھی تھا
جس کا سایہ تھا ہوا از بالِ ہما جاتا رہا

ہو گیا بے کار ہی سا مشغلہ عرضِ ہنر
جب مزاجِ شعر کا رمز آشنا جاتا رہا

وہ بزرگِ محترم، وہ پیکرِ علم و عمل
بے نیاز و بے غرض مردِ خدا جاتا رہا

اس کے جانے سے ہوا بے رنگ و بو اُردو کا باغ
بوئے گل جاتی رہی، رنگِ حنا جاتا رہا!

کر سکا خوشبو کو طالبؔ کب کوئی مٹھی میں بند
موجۂ بادِ صبا آتا رہا جاتا رہا

نئی دہلی۔ ۲۸، مارچ ۱۹۷۶ء

○

جینے کا عذاب

آج پھر کھولی ہے میں نے اپنی یادوں کی کتاب
آج پھر اُٹھنے کو ہے ماضی کے چہرے سے نقاب
آج پھر آنے لگے فصلِ گل ولالہ کے خواب
آج پھر مہکا رہی ہے ذہن کو بوئے گلاب!
پھر سے اُبھرے ہیں وہ ماضی کے نقوشِ رنگ رنگ
عہدِ حاضر پیش کر سکتا نہیں جن کا جواب

یاد ہیں ایامِ طفلی کی بہاریں یاد ہیں
یاد ہیں جیسکوال کی آب وہوائے لاجواب
عہدِ طفلی خوب تھا، عہدِ جوانی خوب تر
ہر تمنا بارآور، ہر ارادہ کامیاب!
پُرسکوں ماحول میں زندہ دلی کا رنگ و نور
مسکراتا، ناچتا، گاتا ہوا عہدِ شباب
دل کا آنگن جلوہ گاہِ جذبۂ جوشِ عمل
کلفتِ سعی و عمل میں لذّتِ جامِ شراب

پائیدار عزم ہمت، امتزاجِ ہوش و ہوش
وہ جوانی، جو نہ دیوانی، نہ تھی خانہ خراب!

الغرض مجھ کو میسّر تھے سبھی سامانِ لطف
مطمئن تھا دل کہ مجھ پر وا ہوا رحمت کا باب
لیکن اب مجھ پہ کھُلا یہ بھول تھی ادراک کی
جو نظر آتا تھا دریا، در حقیقت تھا سراب
میں جسے سمجھا تھا تحفہ وہ اسے کہتا ہے قرض
وقت اب لینے لگا ہے مجھ سے گن گن کے حساب!

صورتِ حالات نے کب بدل دی زندگی
بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا مرنے سے جینے کا عذاب

نئی دلی ۱۳؍مارچ ۱۹۷۶ء

نینی تال

اور میں

تری وادی، ترے کہسار کی رعنائی ہے — جو پہاڑوں میں مجھے گھر سے بلا لائی ہے
میں نے اس باغ کی پہلے بھی ہوا کھائی ہے — اس نے بخشی مجھے پہلے بھی شکیبائی ہے
تیسری بار ترے در پہ ہوں آیا نینی!
پھول مرجھائے ہوئے دل کے ہوں لایا نینی!

چوٹیاں تیری بلاتی ہیں اشاروں سے مجھے — ہو گیا پیار سا ان راہ گزاروں سے مجھے
پیڑ لگتے ہیں ترے راج دلاروں سے مجھے — قمقمے شب کو نظر آتے ہیں تاروں سے مجھے
نور صد رنگ کا ہے تال میں عکس تازہ
(جھیل)
نینا دیوی ہے کھڑی مل کے دھنک کا غازہ

دل تو کہتا ہے کہ چل ہار نہ ہمت پیارے — اہل ہمت کے سدا ہوتے ہیں وارے نیارے
تو چلے گا تو ترے ساتھ چلیں گے سارے — ہوں گے ہمراہ ترے سیل رواں کے دھارے
"ڈورتھی سیٹ" پہ پہنچا ہوں کسی طور ضرور
"چائنا پیک" پہ چڑھنا تو ہے کچھ اور حضور!

"ڈُور رکھی ریسٹ، رسے رُومان کی بلاتی ہے   گیت بے شل رفاقت کے ہوا گاتی ہے

یاد کی آنچ لہو میں پریم کا گرماتی ہے   بن کے نذریں سا دھواں ذہن پہ چھا جاتی ہے

ان مناظر میں محبت کی فسوں کاری ہے

یہ وہ جنت ہے جو فردوس پہ بھی بھاری ہے

یہ فضا فکر کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے   پھول پژمردہ خیالوں کے کھلا دیتی ہے

اک نیا عالم احساس سجا دیتی ہے   میری کھوئی ہوئی دُنیا کا پتا دیتی ہے

اپنی ہی ذات کے عرفان میں کھو جاتا ہوں

پھر سے جینے کی تمنّا کو جواں پاتا ہوں

ہے وہی شوق و تمنّا کا تقاضا اب تک

تھا جو پہلے، ہے وہی ذوقِ تماشا اب تک

مَیں نے جی بھر کے نہیں خود کو بھی دیکھا اب تک

اپنے سائے کو بھی سمجھا نہیں "اپنا" اب تک

جس کا مطلوب نہ ہو کوئی وہ طالب کیا ہے

اک تماشہ ہے، عجوبہ ہے، معمّہ سا ہے!

نینی تال ۲۵ مئی ۱۹۷۶ء   (رہنمائے تعلیم دہلی)

یہ چیتاونی تھی کہ تھا حادثہ!!

بچانا مجھے تجھکو مشکل نہ تھا
اشارہ ہوا اور میں بچ گیا

تری چشمِ رحمت کا تھا معجزہ
کہ ابرِ بلا دم زدن میں چھٹا

ہوا صاف مطلع تو آیا خیال
یہ چیتاونی تھی کہ تھا حادثہ!

ملی اور جینے کی مہلت مجھے
بظاہر تو لگتا ہے اچھا ہوا

لئے ہے اُمیدوں کی سیمیں لکیر
ترے ابرِ رحمت کی کالی گھٹا

کسی رنگ میں ہو کسی روپ میں
ہے منظور و مرغوب تیری لکھا

ہوا شکرِ رحمت سے دل فیض یاب
تو آیا زباں پر "مرے کبریا"

ترا شکر تو نے بچایا مجھے
بچایا ہے تو دے مجھے حوصلہ

ابھی دیکھنا ہے بہت کچھ مجھے
جہانِ تماشا کا اچھا بُرا

مجھے دے نگاہِ حقیقت شناس
کہ ہو مجھ پہ آئینہ کھوٹا کھرا

خدایا مجھے ایسی توفیق دے
مرے ہاتھ سے ہو ہر اک کا بھلا

نہ سوچوں کسی کی بُرائی کبھی
بُرا ہے وہی جس کا چنتن بُرا

ہو دل پُرسکوں اور روشن دماغ
تو جینے کا آجائے طالب مزا

نئی دہلی ۵ جولائی ۷۶ء
رہنمائے تعلیم - دہلی

شبھ کامناؤں کے پھول

(اپنے پوتے عزیز ویریندر کی تقریب شادی منعقدہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء نئی دہلی کے مبارک موقع پر۔

ہیں کس قدر نفیس یہ شبھ کامناؤں کے پھول
لایا ہوں میں جو چمن کے خیالوں کے باغ سے

اِن کی مہک سے کیوں نہ معطر ہوں ذہن و قلب
نسبت ہے اُن کو دل سے تعلق دماغ سے

جس دن کا انتظار تھا آہی گیا وہ دن
دل جس کا منتظر تھا وہی شام آگئی

یہ ساعتِ سعید یہ خوشیوں کی شبھ گھڑی
لے کر مسرتوں سے بھرے جام آگئی

لبریز ہے نشاط سے ساغرِ حیات کا
صہبائے انبساط سے مخمور زندگی

خوشیاں بکھیرتی ہیں فضاؤں میں رنگ و نور
اس رنگ و نور ہی سے ہے مسرور زندگی

آشا کا ساتھ تھا تو کمل دل کا کھل گیا
بے کیف جستجو کی خزاں بھی لگی بہار

بچھڑے ہوئے دلوں کو میسر ہوا ملن
اب خواب یا خیال ہے برسوں کا انتظار

ٹیوگی کے تپ کے رنج سے جوگی کے تیاگ سے — دو دل جُڑے ہیں ایک، کہ دو خاندان ایک
دیپَ نَدر ہے دُلہا تو ہے انجو بنی دُلہن — دو جسم تو ضرور ہیں لیکن ہے جان ایک

بوڑھے بزرگ بھی تو بڑے کام کی ہیں چیز — مانا کہ وہ کسی بھی مرض کی نہیں دوا
لیکن خدا نے اُن کی دُعا کو دیا وہ سحر — جس نے دُعا کو سحرِ مجسّم بنا دیا

پھر کیوں نہ ہم بھی اپنے عزیزوں کو سونپ دیں — اپنی دُعا کا گوہرِ نایاب و بے بہا
دل سے دُعا کریں کہ رہیں شاد کام وہ — شفقت خدا کی ان کی نگہبان ہو سدا

مہر و خلوص کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیں
چھوٹوں کا ہو لحاظ بڑوں کا ہو احترام
شنبھ کا منا یہی ہے یہی ہے دعائے دل
طالب وہ کامیاب ہوں اور خوش ہیں مدام

○

نئی دہلی ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء

لہ دُلہا کے باپ : یوگندر کمار کپور
سے دُلہن کے باپ : جوگندر سنگھ بھلہ

عمل

"اعمال کے بغیر ایمان مردہ ہے"

عمل جنسِ ایماں کی میزان ہے — کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہے
عمل آتما جسم ایمان ہے — نہ ہو روح تو جسم بے جان ہے
عمل ہے نشاں قصرِ ایقان ہے — یہ راسخ عقائد کا اعلان ہے
عمل اعتقاد و یقیں کا ثبوت — عمل ذاتِ یزداں کا عرفان ہے
عمل سے ہے کردارِ انساں بلند — اسی سے ہی انسان کی شان ہے
عمل سے ہو عاری تو ہے سنگ و خشت — عمل ہی سے انسان، انسان ہے
عمل عزم کے ارتقا کی دلیل — عمل شوق و ہمّت کا میدان ہے
عمل ہے امینِ صفاتِ بشر — عمل سارے اوصاف کی کان ہے
عمل سے ہے کردار میں پختگی — عمل اہلِ ہمّت کا ارمان ہے
عمل سے نہ منہہ موڑنا جانِ من — عمل زندگی ہے، عمل جان ہے
یہی حکم انجیل ہے یاد رکھ — یہی وید و قرآں کا فرمان ہے
کسوٹی ہیں اعمال، ایمان کی — بغیر ان کے ایمان بے جان ہے
ہیں اعمال اچھے، تو اچھا بشر — یہی طالبِ حق کی پہچان ہے

نئی دہلی ۱۰ مئی ۷۷ء — (مشاعرہ دالِ۔ایم۔سی۔ نئی دہلی)

احساس کے دیے

سونا چھڑک گئی ہے خزاں باغ وراغ میں
پتے جو سبز تھے اب زرد زرد ہیں
پھل پک گئے ہیں وقت کی شاخوں پہ دیکھئے
جو طفلِ ناتواں تھے تنومند مرد ہیں!

پھل پک گئے ضرور مگر ہیں تو خال خال
پتے ہیں زر نگار، مگر ہیں کہیں کہیں
سمبندھ ٹوٹنے کا ہے اب اُن کا شاخ سے
لیکن وہ مطمئن ہیں کہ منزل تو ہے قریں

منزل کا قُرب ہے کہ سویرے کا جھٹپٹا
یہ جھٹپٹا بھی نُور ہے ادراک کے لئے
مدّھم سی روشنی ہے، مگر ہے تو روشنی
طالب بکھیرتے ہیں جو احساس کے دیئے

نئی دہلی ۲۰ مئی ۷۷ء

سُنو، نو جوان دوستو!

بات دل کی میں تم سے یوں کہنے لگا گوشِ دل سے سنو نوجوان دوستو!
دیش اور دھرم کا ہت ہے پیشِ نظر، ورنہ کھلتی نہیں یہ زباں دوستو!
جو مِلا ہے جوانی کا موتی تمھیں، اس کی قدر اور قیمت تو سمجھو ذرا
یہ ہے نایاب ہیرے سے بھی قیمتی، یہ ہے شکتی کا گنجِ نہاں دوستو!
کام کرنے کی ہے تم کو شکتی ملی، دیش بھگتی کا ہے تم کو ادھر ملا
ایک بھی سانس بے کار جانے نہ دو، دیش ہے جسم اور تم ہو جاں دوستو!
ہے تمھارے ہی دم سے یہ دُنیا بسی، ہے تمھارے ہی دم سے یہ محفل سجی
زندگی تم سے کرتی ہے اٹھکیلیاں، زندگی تم پہ ہے مہرباں دوستو!
کام کرنے سے ہو گا وطن کا بھلا، صرف باتوں سے کچھ ہونے والا نہیں
ہے عمل بزمِ ہستی کا روشن کنول، ہے عمل زندگی کا نشاں دوستو!
یہ جو طاقت کا جنتا کو احساس ہے، عکس ہے یہ تمھارے ہی کردار کا
دیش بیدار ہے، قوم ہشیار ہے، نوجواں اس کے ہیں پاسباں دوستو!
رہ نوردی کی رفتار ڈھیلی نہ ہو، کارواں سوئے منزل رہے گام زن
نوجواں اپنے طالب بنیں رہ نما، اور بڑھتا رہے کارواں دوستو!

"رفیعا ر مرّہ ملی"

نئی دہلی ۲۹ رمئی ۷۷ ۱۹ء

اپنے پڑوسی کو اپنی مانند پیار کرو

محبت کا پیکر، دیا کا دریا — گنہ گار و بیمار کا آسرا
مروّت کی صورت حلیم و کریم — وہ بیٹا خدا کا تھا مثلِ خدا
بنی نوعِ انساں سے تھا اس کو پیار — صفاتِ الٰہی کا وہ عکس تھا
دیا اس نے درس محبت ہمیں — بتایا کہ ہر دکھ کی ہے یہ دوا
بناتی ہے یہ خویش کو خویش تر — یہ دل جیت لیتی ہے اغیار کا
یہ بے مہر وحشی کو کرتی ہے رام — یہ دیتی ہے سکھ شانتی کا پتا
کھلے دل سے بانٹو اسے دوستو — سب اپنے ہیں کوئی نہیں دوسرا
کرو پیار اپنے پڑوسی سے تم — کہ وہ بھی تمھیں سا ہے ابنِ خدا
جگہ دو اسے دل میں تم پیار سے — اسے لو محبت سے اپنا بنا
پڑوسی کو اپنوں ہی سا پیار دو — کرو اس کا پیدائشی حق ادا
جو تم اس کے دکھ سکھ میں ہو گے شریک — تو وہ بھی کرے گا تمھارا بھلا
دو ہمسائے کو پیار کی نعمتیں — کہ ہے پیار اک نعمتِ بے بہا

کرو اپنے ہمسائے سے خود سا پیار
ہے طالب یہ تعمیلِ حکمِ خدا

نئی دہلی ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء — (مشاعرہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے نئی دہلی)

پڑوسی

از رہِ تلطّف وہ — مجھ سے یوں ہوئے گویا
"آپ کو تو پہلے بھی — میں نے ہے کہیں دیکھا
کب کہاں ہوئے درشن — یاد کچھ نہیں آتا"
مَیں نے عرض کی "حضرت! — یہ حقیر سا بندہ
آپ کا پڑوسی ہے — آپ کا ہے ہم سایہ

یہ بھی اک تماشا ہے

"آپ کو پڑوسی پر — اجنبی کا ہے دھوکا!
"عقل محوِ حیرت ہے — کیا سے کیا ہوئی دُنیا!
آپ ٹھیک کہتے ہیں — لیکن اس کا کیا کیجئے
ایک غیر واقف سے — بات کیا کرے کوئی
جب نہ ہو تعارف ہی — ٹھیک ہے کیا "نمستے" کی
وہ تو ہے بجا لیکن — یہ ہے پیار کا سودا
پیار کے پیمبر نے — جو خدا کا بیٹا تھا
بائیبل میں لکھا ہے — پیار کر پڑوسی سے
اس کا دُکھ سمجھ اپنا — اس کا سُکھ سمجھ اپنا"
حُکم یہ مسیحا کا — پیار کا صحیفہ ہے
درس ہے محبت کا — پریم کا سندیسہ ہے

نئی دہلی ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء — "دی سینک سماچار" نئی دہلی

شردھانجلی

(مہاتما آنند سوامی سرسوتی جی (سابق لالہ خوشحال چند خورسند ایڈیٹر آریہ گزٹ لاہور
اور بانی "ملاپ" اخبار) ۹۶ سال کی عمر میں ۲۴ اکتوبر ۷۷ء کو سورگباش ہوئے۔)

مسکان رہی ہونٹوں پہ ترے جیتے جی بھی مرتے دم بھی
خوشیوں کے تقاضے بھی جھیلے، طوفانِ حوادث کے غم بھی
خوشحال رہا ہر حال میں تو، خورسند رہا آنند رہا
گھر بار کی خوشیاں بھی دیکھیں، دیکھا سنیاس کا عالم بھی!

لگ بھگ سَو سال کی آیو تک، جن جیون کا سنچار کیا
عزم اور عمل کے جادو سے آشاؤں کو ساکار کیا
اُپدیش دیا ہر حال میں خوش رہنے کا غم کے ماروں کو
چِنتا سے پیڑت لوگوں کے جیون پتھ کو ہموار کیا

رس کانوں میں ٹپکاتی تھی اے تیری میٹھی بانی کی
شیرینی اس میں شہد کی تھی اور شیتلتا تھی پانی کی!
تیرے کردار کی ویدی پر وہ پھول چڑھائے ہیں اس نے
جو پھول چنے تھے طالب نے جب تو نے گل افشانی کی

نئی دہلی ۲۶ اکتوبر ۷۷ء
("ریفارمر" دہلی)

کرسمس

(بڑا دن)

کرسمس کی خوشیاں مبارک ہوں سب کو
ہو سب کو یہ دورِ مسرت مُبارک!
جنم دن ہے پیمبرِ آشتی کا
مسیحا کا یوم ولادت مُبارک!
خوشی بانٹتی پھر رہی ہے محبت
یہ تقسیم جنسِ محبت مُبارک!
فضا خوش سگالی کی من موہنی ہے
یہ آپس کا پیار اور چاہت مُبارک
نیا سال ہر سال دیتا ہے درشن
ہو ہم سب کو یہ نیک ساعت مُبارک

نئے سال کی آمد آمد ہے طالبؔ
نئی زندگی کی بشارت مبارک!

نئی دہلی ۱۹ فروری ۷۷ء

آزاد ہندوستان

اعجاز ہوا ہے کہ کرامات ہوئی ہے
کافورِ غلامی کی سیہ رات ہوئی ہے
بیدار ہوئے لوگ کہ پربھات ہوئی ہے
بھارت میں نئے یگ کی شروعات ہوئی ہے!

آزاد ہوا دیش تو ممتاز ہوئے ہم
اقوام کی مجلس میں سرافراز ہوئے ہم
سنتے ہیں جسے لوگ وہ آزاد ہوئے ہم
توقیر بڑھی ہے تو بڑی بات ہوئی ہے!

آزاد زباں بھی ہے تو آزاد قلم بھی
بے خوفِ ستم بھی ہے تو بے باک کرم بھی
آزاد اگر وہ ہیں تو آزاد ہیں ہم بھی
اب کون کہے کس کو کہاں مات ہوئی ہے!

آزاد ہوئے ہیں تو مسائل بھی بڑھے ہیں
اغراض کی پھیلن ہے، عداوت کے گڑھے ہیں
حرص اور ہوس خیر سے پروان چڑھے ہیں
پیچیدہ سوالات کی بہتات ہوئی ہے

اب کس کو ضرورت ہے کہ کرے فکرِ وطن کی
اوصافِ حمیدہ کی، روایاتِ کہن کی
وعدوں کے تقدس کی، خداؤں کے چلن کی
منصب کی طلب قاضیِ حاجات ہوئی ہے

جتنا کا ہے اربابِ حکومت سے یہ شکوا — تھا جن کو جِتنا اُس نے بڑے شوق سے جیتا
سیوا کا نہیں اُن کو حکومت کا ہے چسکا — برتر ز وطن اُن کے لئے "ذات" ہوئی ہے

اب کون اُنھیں فرض کا احساس دلائے — اب کون اُنھیں وقعتِ کردار بتائے
اب کون اُنھیں زیست کے آداب سکھائے — ایثار کی تلقین خرافات ہوئی ہے

پھر کیوں نہ ابھی فکر کا انداز بدل دیں — اس دیش کے جمہور کی آواز بدل دیں!
ناقص ہے اگر ساز، تو یہ ساز بدل دیں — طالب یہ عیاں صورتِ حالات ہوئی ہے!

نئی دہلی ۔ ۱۱ اگست ۱۹۷۸ء (مشاعرہ وائی ایم سی اے نئی دہلی)

چھوٹے بڑے خداؤں کی اس ریل پیل میں
سب سے بڑے خدا کو کوئی پوچھتا نہیں!
کہتا ہوں لاکھ تو بھی زمانے کے ساتھ چل
اس دل کا کیا کروں کہ مری مانتا نہیں!
کیوں ڈر گئے ہو یوں جھجک کر آئینۂ حیات
یہ عکس آپ کا ہے کسی اور کا نہیں
طوفانِ برق و باد کی جھیلی ہیں یورشیں
ساحل ہوں میں کہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں!

نئی دہلی ۔ ۱۱ اپریل

شرابِ خانہ خراب

اُردو کے شاعروں کو رہا خبط یہ مُدام
رنگیں کریں شراب سے سجادۂ کلام
پیرِ مُغاں کی بات کو سمجھیں خدا کا حکم
ساغر بدست ساقیٔ مہوش کے ہوں غلام!

دِلدادگانِ عیش کی محبوب شاعری
دیتی رہی عوام کو ترغیب مے کشی
لیکن کبھی کسی پہ نہ افشا کیا یہ راز
ہیں دُخترِ رز کے بھیس میں غمہائے زندگی!

پی پی کے ہو گئے جگر اور دل خراب
دینے لگا دماغ بھی بے ربط سے جواب
عہدِ شباب ہی میں قویٰ مضمحل ہوئے
آزارِ جسم و جاں سے ہوئی زندگی عذاب

جلتی ہے شمعِ زیست کی لیکن بجھی بجھی
اب اس میں روشنی ہے نہ باقی ہے دلکشی
صحرائے لاشعور میں جلتی ہوئی چِتا
مرگھٹ میں ناچتے ہوئے شعلوں کی روشنی!

یہ مے نہیں یہ تیرے عزیزوں کا خُون ہے
غیروں کا یہ لہو نہیں اپنوں کا خُون ہے!
کیا اپنے خُون کو بھی تو پہچانتا نہیں
کم بخت یہ تو تیرے ہی بچوں کا خون ہے

پیتا رہے گا خون عزیزوں کا تا بکے
خونِ رگِ حبیب کو پیتا رہے گا مے
پانی میں آگ گھول کے پینے لگا ہے کیوں
اِتنا تو سوچ یہ بھی ہے پینے کی کوئی شے!

آغازِ مے کشی ہے مُصیبت کی ابتدا
ہر دھرم نے حرام کہا اس کو برملا
دیش اور سماج کے لئے لعنت ہے واقعی
ہے سبھیتا کے نام پہ ٹیکا کلنک کا!

ہشیار! اس کے دام میں آنا نہ دوستو
زنہار اس سے پریم بڑھانا نہ دوستو
طالب یہ وہ مرض ہے نہیں جس کا کچھ علاج
جی جان کو یہ روگ لگانا نہ دوستو!

نئی دہلی۔ ۸ مئی ۷۸ء (مشاعرہ والے ایم سی نئی دہلی)

پیار کا پودا

حُسن گیا جب حسن نظر سے — ہُوک سی اُٹھی قلب و جگر سے
اِک موہوم سی بات کے ڈر سے — میں گھبرا کر بھاگا گھر سے

من کی مانی، بن میں آیا — رُوپ انوپ نے جی بہلایا
بال سُنہری کُنجن کایا — اُوپر دھوپ اور نیچے سایا

پربت پہ لہرانے والو! — اس کی شان بڑھانے والو
من کی پیاس بجھانے والو! — آنکھوں میں کھب جانے والو

چمبل کے اونچے اونچے پیڑو! — بل کھاتی، لہراتی بیلو!
بیڑ کی شاخو! شاخ کے پتو — کومل پھولو! تیکھے کانٹو!

کچھ رُوٹھے، روٹھے لگتے ہو — کیوں ناواقف سے بنتے ہو!
کچھ کہتے ہو، نہ کچھ سُنتے ہو — کیا مجھ سے سچ مچ رُوٹھے ہو!

مجھ کو نہ سمجھو تم بیگانہ — اپنا ہوں مجھ کو اپنانا
تم ہو شمع تو میں پروانہ — پر کسی کو کہہ لو ”دیوانہ“

غیر نہیں ہوں میں دیوانو! — اپنا ہوں میں اپنا جانو
غور سے دیکھو اور پہچانو — آنکھوں دیکھی بات تو مانو

میرا دل ہے پیار کا پودا — سب پودوں سے ہے یہ انوکھا
رنگ برنگا، نیارا نیارا — پھول کے نیچے پھول سا کانٹا

جس کی پھبن ہے سب کو پیاری — جس پہ موہت ہیں نر ناری
جس کو اپنا سکے کرشن مراری — جس سے جیون کیسر کیاری

آؤ رہیں مل جل کے ایسے — نیل گگن میں جیسے تارے
جیون بھی اک کھیل ہے پیارے — جیت گئے تو وارے نیارے

جیون پتھ کے راہی ہو تم — جینا ہے تو مل کے چلو تم
پریم کا بدلہ پریم سے دو تم — طالب سب سے پیار کرو تم

دارجیلنگ ۔ کلکتہ جون، جولائی ۱۹۷۸ء

بُرائی شراب کی

(برائے مشاعرہ وائی۔ ایم سی اے)

سب لوگ کر رہے ہیں بُرائی شراب کی
کہتے ہیں اس نے دیش کی حالت خراب کی
رکھ دی بدل کے شکل گنہ اور ثواب کی
آنے لگی ببول سے خوشبو گلاب کی
بھارت کی سُوجھ بُوجھ کو کیا جانے کیا ہُوا!
وِرثہ میں جو مِلا تھا خزانہ لُٹا دیا!

شادی کی دعوتوں میں چلن اس کا عام ہے
سب کو حلال، مفت کی دارُو کا جام ہے
دیکھو جسے وہ لال پری کا غُلام ہے
آزادیوں کی دھوپ ہے، راحت کی شام ہے
عورت بھی ساتھ مرد کے پیتی ہے آج کل!
پیتی ہے اور شان سے جیتی ہے آج کل!

بچوں کا پیٹ کاٹ کے پیتے ہیں جو شراب
ملتا ہے اس جہاں میں انھیں نرک کا عذاب
کر لیتے ہیں دماغ، جگر اور دل خراب
دُکھ درد تن بدن کا اُٹھاتے ہیں بے حساب

بچوں کا خون پیتے ہیں پیالے میں ڈال کے
کھاتے ہیں لختِ دل کا کلیجہ نکال کے

طالب کی آج آپ سے ہے اِلتجا یہی
مانو اِسے تو اس میں بھلائی ہے آپ کی
اس نامُراد شئے سے لگانا نہ جی کبھی
ہُشیار! آگ ہی تو ہے پانی بنی ہوئی

ظالم کے چھل فریب میں آنا نہ دوستو!
ڈس لے گا ناگ ہاتھ لگانا نہ دوستو!

نئی دہلی، ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء

شراب کے نقصانات

ہم سب لڑیں گے مل کے لڑائی شراب کی — دراصل ہے یہ جنگ گنہ اور ثواب کی
بھارت کی سبھیتا میں ہے امرت کا رس بھرا — پچھم کی سبھیتا ہے شراب و کباب کی

پچھم کی سبھیتا نے بڑھائی ہے مے کی شان — ہم نے سمجھ لیا یہ امارت کا ہے نشان
پینے لگے امیر، غریب اور بھک منگے — پیچھے رہے کسی سے نہ مزدور اور کسان

رندِ شراب حال کا کیا پوچھتے ہو حال — بیوی کی اس کو فکر نہ بچوں کا کچھ خیال
اپنا ہی جو نہ ہوش تو اوروں کا ذکر کیا — احساس ہی نہ ہو تو محبت کا کیا سوال

بچوں کا خون پینا ہے ہر دھرم میں حرام — سمجھے اسے روا جو اسے دور سے سلام
خونخوار بھیڑیے بھی اسے جانتے نہیں — اور یہ کہ آدمی تو چڑھاتا ہے اس کے جام

پینا شراب کا ہے ہر اک حال میں برا — طالب نہ بھول کے بھی کبھی اس کو منہ لگا
ناگن یہ بِس بھری ہے نہ چھونا اسے کبھی — پانی بھی مانگتا نہیں اس کا ڈسا ہوا

نئی دہلی ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء — (مشاعرہ دوائی ایم سی اے کھچڑی پور)

جے پی کا خواب

(لوک نائیک شری جے پرکاش نارائن کی
رحلت کی خبر پڑھ کر۔)

دس لاکھ لوگ کس لئے آئے ہیں شوک سبھا — جے پی کی روح مجھ سے یہی پوچھتی رہی
نعرے لگا رہے ہیں جو اب "زندہ باد" کے — جیتے جی اس کی بات بھی سنتے نہ تھے وہی

جنتا کا انگ انگ الگ ہو چکا ہے اب — جو پارٹی بنائی تھی اس نے وہ کیا ہوئی؟
چپ چاپ اپنی آس کا پیتا رہا لہو — چپ چاپ دیکھتا رہا آپس کی دشمنی

وہ انقلاب جو ہو بہ ہر طور انقلاب — وہ انقلاب جس کو مکمل کہیں سبھی
وہ انقلاب جس کا وہ لیتا رہا تھا خواب — کیا اس حسین خواب کی تعبیر ہے یہی؟

کیا کیا نہ اس کے واسطے اس نے سہے عذاب — کیا کیا نہ قید و بند سے جانِ حزیں لڑی
تعبیر ہو گئی تو رہا خواب وہ کہاں — اچھا تو ہے یہی کہ رہے خواب خواب ہی

طالب ہر اک خواب حقیقت نہ بن سکا
سچ ہے کسی کے خواب نہ پورے ہوئے کبھی

۱۰ اکتوبر ۷۹ء — ("سفارت" نئی دہلی)

نو یُگ کا اعلان ہے بچّہ

پھولوں کی مُسکان ہے بچّہ
جیون گیت کی تان ہے بچّہ
جسم ہے انسان، جان ہے بچّہ
مَن مندر کی شان ہے بچّہ
چھوٹا سا بھگوان ہے بچّہ!

بچ رُوپ میں ہرکشن کھڑا ہے
سُندر بچپن پھولوں سے لدا ہے
اک سپنا سا کار ہُوا ہے
چھوٹا ہونے پر بھی بڑا ہے
مانوتا کا مان ہے بچّہ!

بڑے بڑوں سے اس کا رشتہ
پنڈت نہرو اس کا چاچا
گاندھی بھی تھا "باپو" اس کا
یہ پرہلاد، یہ کرشن کنھیا
بھگت کبھی بھگوان ہے بچّہ!

دُکھ سُکھ میں مُسکانے والا
غم کو دُور بھگانے والا
سب کا مَن پرچانے والا
گھر میں خوشیاں لانے والا
سُکھ اور چین کی کان ہے بچّہ!

صُبح بہاراں، نُور کا تڑکا
آنے والے دَور کا جلوا
گلشن گلشن، صحرا صحرا
آج تمہارا، کل ہے اس کا!
نو یُگ کا اعلان ہے بچّہ!

نئی دہلی۔ ۱۳، نومبر ۷۹ء — برائے مشاعرہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ بچہ کا بین الاقوامی سال [illegible]

چُپ کی داد

ہو سکے تو دیجیے گا چُپ کی داد — ورنہ خاموشی ہی میں کھو جائیے

ہو جو کچھ کہنے کو تو کہیے ضرور — کچھ نہ ہو تو کچھ بھی مت فرمائیے

کچھ نہ کہنے میں مزا کچھ اور ہے — آپ بھی گونگے کا گُڑ کھا لیجیے

کہنے والے کا کہا سُنیے بہ شوق — تبصرہ لیکن نہ اس پر کیجیے

تابِ گویائی کو کہیے الوداع — لذتِ گفتار کو کیجے سلام

سُن کے چُپ رہنے کی عادت ڈالیے — من کا مندر ہی بنے گا سورگ دھام

خامشی سونا ہے چاندی گفتگو — ملتا ہو سونا تو چاندی کون لے

چُپ کا موتی پا کے طالب کچھ نہ مانگ — مانگنا بھگوان سے بھی چھوڑ دے

نئی دہلی ۲۵ر جولائی ۷۹ء

ظلمتِ شب کے در پہ دستک دی — بادِ نورِ سحر کے جھونکے نے

یا کسی کا خیال آیا ہے — گنگناتا ہوا حسین نغمے

پَو پھٹی ہے نئے خیالوں کی — پیدا ہونے کو ہے نیا خورشید

اک نیا دَور آنے والا ہے — موت جب ہوگی زندگی کی کلید

لطف جینے کا ہے جبھی طالب — منزل و شوق میں رہے پیکار

سخت کوشی کی قدر و قیمت ہے — سخت جانی ہو زندگی کا وقار!

نئی دہلی ۸ر فروری ۷۸ء —— ("سفارت" نئی دہلی)

قیل و قال کی فرصت کس کو، دِلوانے کو کام بہت ہے،
دانا رہتا ہے اُلجھن میں، نادان کو آرام بہت ہے

جانے کیسے لوگ ہیں وہ، جو پی کے بہکنے لگتے ہیں
اُن کے ظرف کو کیا کہیے کہ جن کو ایک ہی جام بہت ہے

تُو نے شوق کی جوت جگا کر، زیست کی منزل آساں کر دی
میں نے شعورِ مقصد پایا، مجھ کو یہ انعام بہت ہے،

طالب آدمی تو اچھا ہے، شاعر بھی کچھ بُرا نہیں وہ
جانے پھر یہ کیا چکّر ہے، بے چارہ بدنام بہت ہے

نئی دہلی ۲۶ فروری ۸۷ء

"ہما" لکھنؤ"

غمِ دل کی زباں اہلِ نظر کم سمجھتے ہیں
نہ دل کو دل سمجھتے ہیں نہ غم کو غم سمجھتے ہیں

وہ کہتے ہیں اہنسا ہے دلِ انساں کی کمزوری
نوائے زندگی کو زیست کا ماتم سمجھتے ہیں

جنونِ کشت و خوں کو نام دیتے ہیں شجاعت کا
اماوس کی شبِ تاریک کو پونم سمجھتے ہیں

رواداری کو ہم سمجھے ہوئے ہیں درد کا درماں
محبت کو دلِ مجروح کا مرہم سمجھتے ہیں

مہاویر اور گوتم اور گاندھی جس کے رہبر تھے
تعجب ہے کہ ہم اُس راہ کو پُر خم سمجھتے ہیں

بنایا ہے اہنسا کو اصولِ زندگی ہم نے
سکونِ زندگی کا راز طالب ہم سمجھتے ہیں

نئی دہلی ۳ / اپریل ۶۶ء ——— (مہاتما لکھنؤ)

آئی نظر اُمید بھی مجھ کو بہ رنگِ یاس
کتنی مری نگاہِ تجسس ہے غم شناس

اس خود غرض دیار میں ناپید ہے خلوص
دُنیائے آب و گِل میں محبت کی بُو نہ باس

کیا وہ بھی پھول ہے نہ ہو جس میں رنگ و بُو
کیا وہ بھی زندگی ہے نہ باقی ہو جس میں آس

مجھ سے نہ کھل سکی مرے خوابوں کی زندگی
میرا مزاج خشک ہے آسد کا نہ راس

ہر شے غمِ حیات کی تصویر بن گئی
اک دل کے ڈوبنے سے ہے سارا جہاں اداس

اب امتیاز خاک کریں خوب و زشت میں
کانٹوں کو بھی پسند ہے پھولوں ہی سا لباس

حوروں سے بھی حسین وہ اچھوتا خیال تھا
پہنا سکا نہ جس کو میں الفاظ کا لباس

خوددار ہوں مگر نہیں مغرور و خود پسند
تقدیر سے ملی ہے مجھے چشمِ خود شناس

طالب مجھے خلوص و محبت عزیز ہیں
میرے کلام میں ہے مرے دل کا انعکاس

نئی دہلی ۱۹ / اپریل ۶۶ء (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

وقت جانے کا ہوا لیکن نہیں تیار ہم — کون سا منہ لے کے جائیں رُوٹھے یار ہم

شاکرِ لطف و کرم رہتے ہیں ہر اک حال میں — غفلتِ ساقی سے کیوں ہونے لگے بیزار ہم

جستجو اور دید میں حائل تھا دریائے فراق — آپ تھے اُس پار اور دیکھا کئے اِس پار ہم

ہم نے دیدِ یار کو سمجھا نہیں اک مشغلہ — خونِ دل سے سینچتے ہیں حُسن کا گلزار ہم

اُس نے ہر اک رنگ میں برتی ہے ہم سے بےرُخی — آہ! کیوں کرتے رہے ہیں زندگی سے پیار ہم

زندگی اب اپنے اصلی رُوپ میں آئی نظر — اک سہانے خواب سے گویا ہوئے بیدار ہم

منزلِ مقصود گردِ راہ میں گم ہو گئی — پھر بھی کرتے جا رہے ہیں راہ کو ہموار ہم

چاہتے تو لُوٹ لیتے کاروانِ مہر و مہ — چاہتے تو روک دیتے وقت کی رفتار ہم

فکر کے بدلے ہوئے دھاروں سے طاقت پوچھ لو — غازیِ گفتار تھے یا غازیِ کردار ہم

نئی دہلی ـ ۱۷ر جون ۶۶ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

وہ تو اِترائے بہاروں کو خزاں کہتے ہوئے

میں کٹا جاتا ہوں اُن کو باغباں کہتے ہوئے

بیچ ہی ڈالا متاعِ قوم، ننگِ قوم نے

جو بھی "غداری" اُسے مجبوریاں کہتے ہوئے

کس قدر تسکین ہوتی ہے مرے پندار کو

خود سری کو سرفرازی کا نشاں کہتے ہوئے!

دل لرزتا ہے خلوصِ بے غرض کے حشر پر

جانِ جانی — یہ حدیثِ دوستاں کہتے ہوئے

دل کی کمزوری پہ سچ سچ کانپ اُٹھتا ہے ضمیر
ذرّۂ ناچیز کو، کوہِ گراں کہتے ہوئے

رازگوئی بھی بذاتِ خود بڑی دل چسپ ہے
لُطف آتا ہے رموزِ رازداں کہتے ہوئے

نامکمّل ہی رہی طالبؔ غمِ انساں کی بات
جَل بجھے ہم دل جلوں کی داستاں کہتے ہوئے

نئی دہلی۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۶ء

غم و افکار نے دل کی جوانی ختم کر ڈالی
خیالِ عاقبت نے زندگانی ختم کر ڈالی
کبھی خوابوں کی جنت میں رواں تھی کیف کی نہریں
حقائق نے مگر اُن کی روانی ختم کر ڈالی
بہت دل چسپ قصہ تھا، بڑی دلکش حکایت تھی
فسانہ گو نے اک رنگیں کہانی ختم کر ڈالی
مری یادوں کے غنچوں کو مسل ڈالا حوادث نے
بہارِ عہدِ رفتہ کی نشانی ختم کر ڈالی
مسیحا نے مرے سر درد کا درماں کیا لیکن
دلِ ایذا طلب کی شادمانی ختم کر ڈالی
غمِ دُنیا نے دُنیائے معانی کو بدل ڈالا
نگاہِ نکتہ رس کی نکتہ دانی ختم کر ڈالی

○

حبیسِ اقتدار کے دم سے ہوں زندہ ‏— پروایاتِ کہن پر مر رہا ہوں
رحیم و بندہ پرور ہے جو ہستی ‏— تعجب ہے اُسی سے ڈر رہا ہوں
اُسی کے حکم کی تعمیل ہوگی ‏— یونہی خود کو پریشاں کر رہا ہوں
خدا میرا، جہاں میرے خدا کا ‏— جہاں والوں سے ناحق ڈر رہا ہوں
سکونِ دل بڑی نایاب شے ہے ‏— سکونِ دل کی خاطر مر رہا ہوں
بقدرِ ہوش و ہمت زندگی ہے ‏— حیاتِ نیم جاں سے ڈر رہا ہوں

نہیں دیوانگی تو اور کیا ہے
دماغ و دل کا سودا کر رہا ہوں

نئی دہلی ۲۶ ستمبر ۶۶ء

مجھ کو بہلائے گی تقدیر کہاں تک آخر ‏— رہ دکھائیگی نہ تدبیر کہاں تک آخر
طعنۂ احباب کے پیکان قضا ہوتے ہیں ‏— میں سہے جاؤنگا یہ تیر کہاں تک آخر
آؤ دُنیائے حقیقت کی ذرا سیر کریں ‏— خواب در خواب کی تعبیر کہاں تک آخر
آنکھ دی ہے تو مجھے تابِ نظارا بھی دے ‏— حسرتِ جلوۂ تنویر کہاں تک آخر

تا بکے قیدِ روایات کے بندھن طالب
زنگ خوردہ سی یہ زنجیر کہاں تک آخر

نئی دہلی ۱۲ ستمبر ۶۶ء

○

گلشنِ پُر بہار میں بادِ خزاں نہ آئے کیوں
حسنِ بہارِ زندگی موت کو بھی نہ بھائے کیوں

فکر و نظر پہ لگ گئیں راہ و روش کی بندشیں
جلوہ گہہ خیال میں آئے تو کوئی آئے کیوں

جس نے بنا لیا اُسے قبلہ نمائے زندگی
موت بھی اُس کے سامنے بن کے دلہن نہ آئے کیوں

عرصۂ روزگار میں عزم و عمل کی جیت ہے
خوفِ شکست سے بھلا آدمی خوف کھائے کیوں

محفلِ انبساط میں ذکرِ ملال بے محل
سازِ حیات پر کوئی نغمۂ غم سنائے کیوں

اپنی نگاہ و یاس میں منظرِ مرگ دل لئے
جا کے بہشت میں کوئی دوزخ اسے بنائے کیوں

طالب ضبط کوش کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوا
چپ سی زباں کو لگ گئی آنکھوں میں اشک آئے کیوں

نئی دہلی ۲۶ ؍ فروری ۶۷ء ... آجکل دہلی، غالب نمبر

چشمِ مشتاق کا عالم ہی جدا ہوتا ہے
اُس کے اعجاز سے سوکھا بھی ہرا ہوتا ہے

زیست کے معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں
خونِ دل زینتِ دامانِ وفا ہوتا ہے

ہوتی ہے عظمتِ کردار کی جلوہ پاشی
عزمِ انسان کا جب راہ نما ہوتا ہے

زندہ درگور بنا دیتا ہے اہلِ دل کو
مرگِ احساس کا احساس بُرا ہوتا ہے

جس سے چھن جاتی ہے احساس کی دولت طالب
بالیقیں اُس کا خدا اُس سے خفا ہوتا ہے

لکھنؤ ۲ ؍ اپریل ۶۷ء

○

بہاروں کے بگڑے، خزاں نے سنوارے ۔۔۔ بڑے کام آئے مخالف ہمارے
کسی نے ہمیں چشمِ حیران بنایا ۔۔۔ کسی نے دکھائے ہمیں دن میں تارے
کسی نے کریدا دلِ بے طلب کو ۔۔۔ تو اس راکھ میں سے بھی نکلے شرارے
کسی نے ہمیں دشتِ افکار سونپا ۔۔۔ جہاں عمر بھر ہم پھرے مارے مارے
وہ جذبات کی جانفزا مسکراہٹ ۔۔۔ وہ احساس کے نرم و نازک اشارے
یہ کیا جی میں آئی کہ دریا میں کودے ۔۔۔ چلے جا رہے تھے کنارے کنارے
یہ حالات کی معجزہ کوشیاں ہیں ۔۔۔ کہ غیروں کے ساتھی ہیں سب ہمارے
جو منزل پہ پہنچے تو ہم تھے اکیلے ۔۔۔ کہاں رہ گئے رہ میں رہبر بچارے
بہرحال مرنا تو خود ہی پڑے گا ۔۔۔ ہو جینا تو جی لیں کسی کے سہارے!
ملے گا نہ دل سا کوئی یارِ مشفق ۔۔۔ نہ پاؤ گے عزم و عمل سے سہارے

نہیں جن کے سر میں ابھرنے کا سودا
نہ ابھریں گے طالب کسی کے ابھارے

لکھنؤ ۲۴ مارچ ۶۶ء

○

آئینۂ حیات مرا علم و فن رہا ۔۔۔ بجھ کر بھی یہ چراغ سرِ انجمن رہا
زندہ بشکلِ نور ہیں اقدار دائمی ۔۔۔ نقشِ جدید عکسِ خیالِ کہن رہا
کہتا ہے کون حسن کو حاصل نہیں بقا ۔۔۔ حسنِ خیال بن کے ترا بانکپن رہا

چینی کبھی اُمید کبھی یاس بڑھ گئی — یہ کبھی دل نواز کبھی دل شکن رہا

غربت میں بھی اداس نہ ہونے دیا مجھے — دن رات میرے ساتھ خیالِ وطن رہا

کچھ بھی کہا نہ اُس نے مگر دل کو کیا کہوں — پہروں یہ اپنے آپ سے محوِ سخن رہا

آواز دی کسی نے کہ موت آگئی قریب
یہ سُن کے بھی میں اپنی ہی دھن میں مگن رہا

نئی دہلی۔ ۲۰ جون ۶۷ء — (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

نہ دیدِ یار کو ہم جا سکے تو کیا ہوگا — نہ دل کا حکم بجا لا سکے تو کیا ہوگا

امید و شوق تو محفل سجائے بیٹھے ہیں — وہ آج بھی نہ اگر آ سکے تو کیا ہوگا

فریب کھاتے رہے زندگی گزرتی رہی — نیا فریب نہ جب کھا سکے تو کیا ہوگا

خیال و فکر کے صحرا میں دل ہے آوارہ — جو راہ پر نہ اُسے لا سکے تو کیا ہوگا

تمام عمر اسی فکر میں کٹی طالب
جو مر کے بھی نہ اُسے پا سکے تو کیا ہوگا

نئی دہلی ۳۰ مارچ ۶۸ء — (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

مذاقِ جستجو کی ہو رہی ہیں ترجمانیاں — حقیقتیں سُنا رہی ہیں نت نئی کہانیاں

غضب تو یہ ہوا کہ زندگی سے ہم اُلجھ گئے — نظر وہ آئیں کلفتوں میں غم کی شادمانیاں

دیارِ شور و شر میں اضطراب کا ہجوم ہے — سکوں کی راحتوں پہ چھا گئی ہیں سخت جانیاں

خزاں حیاتِ نو کے بھیس میں چمن پہ چھا گئی — بچا سکیں نہ باغ کو گلوں کی پاسبانیاں

شعور سمٹ و وقت کی سمٹ گئی ہیں سبقتیں　　محیطِ لامکاں ہوئیں بشر کی رازدانیاں
خلا میں کچھ نہیں مگر خلا میں ہم پہنچ گئیں　　خرد سے بے نیاز ہیں جنوں کی کامرانیاں!

نہ مل سکا کہیں خلوص، طالبِ خلوص کو
مگر خراب کر گئیں کسی کی مہربانیاں!

نئی دہلی ۔ ۲۵ر اپریل ۶۸ء

مندر کے پاس گھر ہے، مگر تجھ سے دور ہوں　　تیرا ہی تھا حکم تو میں بے قصور ہوں
رہتا ہوں تیرے سامنے ہر وقت ہر گھڑی　　اس میں ہے کیا کلام، غلامِ حضور ہوں
اتنا قریب ہو کے بھی تجھ کو نہ پا سکا　　کس کو یقین آئے کہ میں باشعور ہوں
یہ دل کی بے حسی ہے کہ احساس کی کمی　　ہیں بے نیازِ جنتِ حور و قصور ہوں

طالب اسی سوال نے بہکا دیا مجھے
منزل کے ہوں قریب کہ منزل سے دور ہوں

نئی دہلی ۲۸ر اپریل ۷۰ء　　(پیامِ مشرق دہلی)

○

فنا کے خوف سے مرتی رہی حیاتِ بشر　　ہوا کے خوف سے بجھتی رہی چراغ کی لو
خزاں کے خوف سے پیلا ہوا گلاب کا رنگ　　یہ کس کے خوف سے دھیمی ہوئی دماغ کی لو

ریاضِ فکر کی رعنائیوں کا ذکر نہ چھیڑ　　دیارِ حسن کی برنائیوں کی بات نہ کر
بہارِ رفتہ کی باتیں ہیں خوب لیکن خواب　　بیانِ خواب سے وابستہ واقعات نہ کر

○

گلہائے اشتیاق و تمنا کا نور تھا　　سمجھا کلیم کوئی سرِ کوہِ طور تھا
تحریکِ دل سے ہو گئے روشن دل و دماغ　　خوشبو کی روشنی تھی نورِ سرور تھا
اپنی نظر سے حسن کو سمجھا ترا جمال　　اپنے ہی دل کا عکس ترے رُخ کا نور تھا

آخر فریب دے گئی لیلائے آرزو
طالب شرابِ شوق کے نشّہ میں چُور تھا

نئی دہلی ۳؍ جولائی ۶۸ء

خواب اور حقیقت کی تصویر نظر آئی　　تدبیر عناں گیرِ تقدیر نظر آئی
آفاتِ مسلسل میں اک ربط نظر آیا　　حالاتِ دگرگوں میں زنجیر نظر آئی
جو اپنے نقائص تھے وہ حسن نظر آئے　　اوروں میں جو خوبی تھی تقصیر نظر آئی
راضی بہ رضا ہو کر دیکھا تو مصیبت بھی　　گلہائے شگفتہ کی زنجیر نظر آئی

یادوں کے جھروکے سے دیکھا تو مجھے طالب
ایامِ بہاراں کی تصویر نظر آئی

نئی دہلی ۔ ۱۲؍ اگست ۶۸ء

تخئیل سے اونچی کوئی پرواز نہیں ہے — اُمّید سے میٹھی کوئی آواز نہیں ہے
انسان کے تجسّس کی خدا تک ہے رسائی — بند اِس پہ کوئی بارگہِ ناز نہیں ہے
ان چاند ستاروں سے بہت دُور گیا ہوں — مِہر و قمر تک مری پرواز نہیں ہے
انسان کی ہستی ہے دریائے مسلسل — انجام نہیں ہے کبھی آغاز نہیں ہے

اِس دَورِ نمائش کا یہ فرمان ہے طاؔلب
بیکار رہے شاعر جو خوش آواز نہیں ہے

نئی دہلی ۲۷ اگست ۱۹۶۹ء

موت کے انتظار کو وقفۂ زندگی نہ دے — برگِ خزاں نصیب کو پھول کی دلکشی نہ دے
میکدۂ مجاز کی شامِ حسیں کو بھول جا — کیف سے بے نیاز کو دعوتِ مے کشی نہ دے
دیکھ تعینات سے توڑ نہ دل خیال کا — مرغِ فلک نواز کو طعنۂ بے پری نہ دے
تیری نگاہِ ناز ہے غیرتِ سحرِ سامری — اپنی نگاہِ ناز کو زحمتِ دلبری نہ دے
میرا خیال بھی غلط، میرا سوال بھی غلط — میرے غلط خیال کو اذنِ غلط روی نہ دے

طاؔلب سادہ لوح کی سادہ دلی پہ رحم کر
یا اُسے سادگی نہ دے یا غمِ زندگی نہ دے

نئی دہلی ۲۵ اپریل ۷۰ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

ساغر نگاہِ ناز کا چھلکا رہے ہو کیوں　　آنچل بہارِ حُسن کا لہرا رہے ہو کیوں

خیرہ ہوئی ہے چشم تماشائے ذوقِ دید　　تجلی رخِ جمیل کی چمکا رہے ہو کیوں

کن مشکلوں سے میں نے بجھائی تھی دل کی آگ　　اس کو ہوائے شوق سے بھڑکا رہے ہو کیوں

تجھنے بھی دو امید کا بجھتا ہوا دیا　　بیگانۂ حیات کو اپنا رہے ہو کیوں

لمحات ہیں کہ وقت نے پھینکے ہیں سنگ و خشت

خوفِ شکست و ریخت سے گھبرا رہے ہو کیوں

نئی دہلی ۳۰ جولائی ۷۰ء　　(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

دل اور رہ ہو گیا ہے کہ دلبر بدل گئے　　یہ کیا ہوا کہ دھرتی اور امبر بدل گئے

غم ہائے روزگار کی آنکھیں بدل گئیں　　دُنیائے خوب و زشت کے منظر بدل گئے

مے خانۂ حیات میں آیا ہے انقلاب　　ساقی کے ساتھ بادہ ساغر بدل گئے

دُنیائے ذوق و شوق کا بدلا ہے رنگ و روپ　　جب سے خیال و فکر کے محور بدل گئے

اس مصلحت کے دور میں مہر و وفا کہاں　　انسان کی سرشت کے جوہر بدل گئے

بیزار مجھ کو دیکھ کے طالبِ حیات سے

صورت گرِ حیات کے تیور بدل گئے

نئی دہلی ۱۵ اگست ۷۰ء　　(رہنمائے تعلیم دہلی)

○

غم سہا ہم نے جی کڑا کر کے   پی لیا زہر بھی دوا کر کے

وقت کٹتا رہا بہر صورت   دل بہلتا رہا دُعا کر کے!

جو بھرم سا تھا وہ بھی کھو بیٹھے   کیا لیا عرضِ مدعا کر کے

بات بنتی نہیں بگڑنے سے   ہم نے دیکھا انھیں خفا کر کے

جو بشر آدمی نظر آیا   ہم نے پوجا اُسے خدا کر کے!

اور کچھ ہو نہ ہو، ہوا یہ تو   دل کو تسکین ہوئی وفا کر کے

بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہ تھی

پھر بھی پچھتائے ہم خطا کر کے!

ریاضِ زندگی رشکِ بیاباں ہے جہاں میں ہوں

حیاتِ آدمی وحشت بداماں ہے جہاں میں ہوں

لگی ہے مصلحت کی مُہر خاموشی زبانوں پر

یہ دُنیا ہے کہ اک شہرِ خموشاں ہے جہاں میں ہوں

مسرت زندگی کی مسکراتی ہے جہاں تم ہو

گلستاں کا گلستاں اشک افشاں ہے جہاں میں ہوں

مری بے کیفیاں مجبوریوں کے گیت گاتی ہیں

غمِ انساں مرے غم سے نمایاں ہے جہاں میں ہوں

فضائے دل کسی کی یاد سے پُر نور ہے طالبؔ
دیارِ شوق میں جشنِ چراغاں ہے جہاں میں ہوں

نئی دہلی - ۱۱ر اگست ۱۹۷۱ء (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

○

بے زری آئی تو چارہ ساز کا آنا گیا — کُشتۂ آلام کو باتوں سے بہلانا گیا
حادثاتِ زندگی نے نفس کی آنکھیں کھول دیں — سامنے آئی حقیقت سحرِ افسانہ گیا
اپنی بے کیفی نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی — زندگی کے ساز پر مجذوب کا گانا گیا
جب سے مایوسی میں بھی جینے کی عادت ہو گئی — دلرُبائے خودکشی سے عشق فرمانا گیا
دامنِ دل کھینچتی ہے وادیٔ پُر خارِ زیست — مشکلاتِ زندگی سے ڈر کے مرجانا گیا
ذوقِ خاموشی نے طالبؔ راز افشا کر دیا
لاکھ پردوں میں بھی یہ ناچیز پہچانا گیا !

نئی دہلی - ۲۴ر اگست ۷۱ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

مسرورِ تمنا کے تبسم کی ضیا اور — مغمومِ اُمیدوں کا سسکنا سا دیا اور
خاموشِ محبت کے تغافل کی الگ بات — دُزدیدہ نگاہوں میں شرارت کی ادا اور
سامانِ تمسخر ہے مرے دل کی صفائی — بے لوثِ تمنا کو نہ آئینہ دکھا اور
جو خود ہو کسی در کا گدا اُس کا ہے یا کیا — بندوں کا کرم اور ہے مالک کی دیا اور
کس کام کا یہ خرقہ، بے کار ہے طالبؔ — بوسیدہ لبادے میں نہ پیوند لگا اور
یہ کشتۂ افراط، وہ افلاس کا مارا — مرنے کی خوشی اور ہے جینے کی سزا اور

کیا خوب ہے آئینِ سزا اور جزا کا — ہوتی ہے خطا اور کی پاتا ہے سزا اور

طالب یہ خیالاتِ جنوں خیز کا آزار
ہوتا ہے فزوں اور جو دیتے ہیں دوا اور

نئی دہلی ۲۸؍ اگست ۱۹۷۱ء

○

بن گئے ہم مذاق کا مضمون — یہ تو اچھا ہوا کہ کچھ تو نہ بنے
ورنہ حسرت ہی رہ گئی ہوتی — کیوں بنائے پہ اُن کے کبھی نہ بنے
آپ نخوت کہیں اسے کہ انا — ہم جھکے اور تو وہ اور تنے
مطمئن ہیں کہ ہم نے کوشش کی — بات اپنی بنے بنے نہ بنے
شوقِ منزل ترا خدا حافظ — راہ پُرخار اور بن ہیں گھنے
پھول پتوں کو تازگی دے کر — جھومتے ہیں خوشی سے خشک تنے
زورِ بازو کا کیا بھروسہ ہے — ساتھ کس کا دیا ہے کس بل نے
وقت نے جب سے پھیر لیں آنکھیں — مجھ کو لمحات بھی لگے ڈسنے
اپنے احساس سے بھی ہوں بدظن — بھر دیا زہر دل میں ناگن نے

ڈھیل دی تھی تمھیں نے طالب کو
اب شکنجے لگے ہو کیوں کسنے

○

مجھ کو دماغ گرمیٔ بازار ہے کہاں
افسردگی میں لذتِ گفتار ہے کہاں

یارانِ مصلحت میں نہیں جوہرِ وفا
اہلِ غرض میں خوبیٔ کردار ہے کہاں

لاکھوں کی بھیڑ میں بھی ہوں سب سے الگ تھلگ
اس شہر میں غریب کا غم خوار ہے کہاں

جلووں کو بھی ہے چشمِ تماشا کی جستجو
وہ پوچھتے ہیں طالبِ دیدار ہے کہاں

کانٹوں میں آ گئی ہے گلِ تر کی تازگی
اب لطفِ سیرِ وادیٔ پُرخار ہے کہاں

ناکامیوں کی دھوپ میں جلتے ہیں دل جلے
صحرائے غم میں سایۂ دیوار ہے کہاں

شوقِ حصولِ زر ہے تو ذوقِ سخن نہ رکھ
نورِ سحر کہاں ہے شبِ تار ہے کہاں

دلی کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہو گیا ہے دل
تنہا بھٹک رہا ہو دلِ زار ہے کہاں

طالب غمِ حیات نے جینا سکھا دیا
اب زندگی کا بار مجھے بار ہے کہاں

نئی دہلی۔ ١٢/ نومبر ١٩٧١ء

دل اور ہوا جب سے ہوئے فکر و نظر اور
لگتا ہے کہ ہیں اور ہوں یہ راہ گذر اور

تخلیق کئے ذہن نے عیب اور ہنر اور
غم اور خوشی اور امید اور حذر اور

ہر چند ستارے ہی نہیں حاصلِ امکاں
ڈھونڈو گے تو پاؤ گے کئی شمس و قمر اور

گلزارِ تمنا ہو ذرا اور بھی رنگیں
دو نخلِ محبت کو ابھی خونِ جگر اور

دیکھیں تو کہاں جا کے ٹھہرتا ہے تجسس
منزل نے پکارا تو بڑھا ذوقِ سفر اور

اخلاص و مروت کی منافق کو خبر کیا　　نفرت کی جلن اور محبت کا شرر اور

کچھ اہلِ نظر ڈھونڈتے رہتے ہیں نقائص
صد شکر کہ طالب کو ملی چشمِ نگر اور

نئی دہلی ۲۰ راگست ۱۹۷۲ء　　(سالنامہ ہمارے تعلیم دہلی)

دردِ دل جو خوں رُلا سکتا نہیں　　گیت بن کر لب پہ آ سکتا نہیں
کیا کرو گے سن کے اشعارِ لطیف　　میں ترنم سے سُنا سکتا نہیں
زخم کچھ ایسے بھی ہوں دل میں لئے　　جو دکھا سکتا، چھپا سکتا نہیں
گفتنی باتوں کا ہے دل میں ہجوم　　شور اتنا ہے سُنا سکتا نہیں

جس نے طالب دل چرایا ہے مرا
اُس سے میں آنکھیں چُرا سکتا نہیں

نئی دہلی - ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء

ذہن و قلب کی بے کیفی کو غرق مے گلفام کیا
دُنیا سے دل اُوب گیا، تو شغلِ بادہ و جام کیا

ہم بھی شامل ہو گئے، آخر پیرِ مغاں کی اُمت میں
دیر و حرم کی خوشنودی کا ترک خیالِ خام کیا

زاہد بن کر لوٹ لیا ہے خواروں کے مے خانے کو
پھر واعظ کا روپ بھرا اور مے کو نذرِ عام کیا

دل کی جلن اور من کی چبھن نے ساتھ نہ چھوڑا جینے جی
ایسے جیون ساتھی پا کر داتا کو پرنام کیا

دین اور دنیا سے منہ موڑا شعر و ادب کے طالب نے
کوئی دیوانہ ہی کہے گا اس نے اچھا کام کیا

نئی دہلی ۳۰ ر دسمبر ۷۲

حسن کا رعب احساس پہ چھا گیا
میں یہ سمجھا مرے گھر خدا آ گیا

دل میں جب جذبِ مسرت ہوا موجزن
میں خوشی کے طلاطم میں گھبرا گیا

میٹھی باتوں سے دل کو تسلی ہوئی
باتوں باتوں میں وہ مجھ کو بہلا گیا

خضر رہ کو یہ حد شوق زحمت کیا
جب نظر قیس کا نقشِ پا آ گیا

مجھ کو اپنی خوشی کی نظر لگ گئی
چاند اپنے ہی سائے سے گہنا گیا

آمد و رفتِ غم سے نہ گھبرائیے
بستے گھر میں تو رہتا ہے آیا گیا

دیکھ لی تیرے طالب کی زندہ دلی
زندگی کے تقاضوں سے گھبرا گیا

نئی دہلی ۶ ر دسمبر ۱۹۷۲ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

من سے مندر میں جلے جوت ترے جوبن کی — تیری خوشبو سے مہکتی مری روداد رہے

یہ بھی اچھا ہے کہ ہم بھول گئے تیری جفا — یہ بھی اچھا ہے کہ احسان ترے یاد رہے

اہلِ دنیا میں رہے پھر بھی رہے سب سے الگ — رہ کے زنداں میں بھی ہم قید سے آزاد رہے

اُن کو رہنا تھا بہر طور اسی گلشن میں — باغباں بن کے کبھی بن کے وہ صیاد رہے

اچھے اچھوں کو بھلا دیتی ہے دنیا طالب
تُو نے کیا کام کیا ہے جو اُسے یاد رہے

نئی دہلی - ۸ جنوری ۱۹۷۳ء (ہما لکھنؤ)

دانشوروں کے ساتھ ازل سے یہی ہوا — کاٹی گئی زباں کبھی سر قلم ہوئے

تقدیر کی لکیر مٹائے نہ مٹ سکی — غم ہائے روزگار نہ رونے سے کم ہوئے

کچھ اور تیز گام ہوا عزمِ کشمکش — جب جادۂ حیات کے پُر پیچ خم ہوئے

طالب ترا کلام ہے نادار کا شباب
پُوچھے گا کون تجھ کو جو ناراض ہم ہوئے

نئی دہلی - ۲۵ فروری ۱۹۷۳ء

O

مقدر میں ہوتا تو سانچے میں ڈھلتے، یونہی جل نہ جاتے، پگھلتے پگھلتے
اصولوں سے ہر وقت کرتے کنارا، نہ بنتی اگر بات، پہلو بدلتے
یہ مانا کہ رہبر بنایا تھا اُن کو، مگر رہبروں کے بھی ہیں کچھ فرائض
اگر کچھ بھی چلنے سے پہلے بتاتے، تو ہم اپنی مرضی سے چلتے نہ چلتے
نہایت ہی تیکھی تھی ڈھلوان، اس پہ غضب کا اندھیرا، قیامت کی پھسلن
انا کے قدم ڈگمگائے تو پہنچے درِ مے کدہ تک پھسلتے پھسلتے!
یہ مجبورِ فطرت کی معذوریاں تھیں کہ جبرِ مشیت کا تھا ہاتھ اس میں
بدلنے کا پختہ ارادہ کیا تھا، مگر رہ گئے ہم بدلتے بدلتے
محبت کو پروانے دل میں سموتے، تو کم ظرف آپے سے باہر نہ ہوتے
جو وہ اپنی حد سے نہ کرتے تجاوز، نہ جان ان کی جاتی، نہ پر ان کے جلتے
مرے دوست کی تھی یہ بے التفاتی، مرے دل میں جو پھانس بن کر چبھی تھی
نکل بھی گئی پھانس لیکن چبھن تو، نکلتی ہے دل سے نکلتے نکلتے
یہ سچ ہے کہ مایوسیوں سے ہے نفرت، مگر ذہن یہ بات بھولا نہیں ہے
کہ ہر کام میں وقت لگتا ہے عاؔبد، سنبھل جائیں گے ہم سنبھلتے سنبھلتے"

نئی دہلی - ۴ر اپریل [illegible]ء

(رہنمائے تعلیم نئی دہلی)

○

غمِ دل کا مداوا اور کیا ہے — سہے جاؤ سہا جائے جہاں تک

جنوں بیگانۂ سود و زیاں ہے — خرد کی ہے پہنچ سود و زیاں تک

بھڑک اٹھی دلِ مجبور کی آگ — لپک شعلوں کی پہنچی آسماں تک

بہت دھیمی ہے کمزوروں کی آواز — نہ پہنچے گی خدا سے آپ وہاں تک

اگر خودداریٔ دل کے ہو طالب

نہ حرفِ مدعا لاؤ زباں تک

نئی دہلی ۱۵ اپریل ۳۷ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

تجھے پا کر بھی دل مغموم کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

مسرت کیف سے محروم کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

کیا تھا اہتمامِ رنگ و بو ہم نے گلستاں میں

فضائے بوستاں مسموم کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

جسے مختار اور صورت گرِ تقدیر ہونا تھا

وہی مجبور اور محکوم کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

نہ دل میں شوق کی شدت، نہ غم میں درد کی لذت

یہ بے کیفی خدا معلوم کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

نہ کچھ بھی کر کے کیوں طالب گنہ گاروں میں شامل ہے
وہ سب کچھ کر کے بھی معصوم کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

نئی دہلی ۲۸ اپریل ۱۹۷۳ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

اس دلِ ناکام کو ناکام ہونا چاہیئے
سادہ لوحی کا یہی انجام ہونا چاہیئے

اس کا ہر اک ارطشت از بام ہونا چاہیئے
صاف گو کو بھی بدنام ہونا چاہیئے

آرٹ کے پردے میں چھپ سکتی نہیں عدامیاں
آرٹ حُبِّ قوم کا پیغام ہونا چاہیئے

وقف بہرِ قوم ہونا چاہیئے ذہنِ بشر
دل وطن کا بندۂ بے دام ہونا چاہیئے

مصلحت سے بے نیازی ہی رہا تیرا شعار
تجھ کو طالب اور بھی گمنام ہونا چاہیئے

نئی دہلی ۲۷ مئی ۱۹۷۳ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

خزاں برنگ بہاراں ہے دیکھیئے کیا ہو
سکوں کے بھیس میں طوفاں ہے دیکھیئے کیا ہو

الٰہی خیر ہو، حالات ہی دگرگوں ہیں
کبھی جو کفر تھا ایماں ہے دیکھیئے کیا ہو

رواں دواں تھے جو لمحات رک گئے یکدم
سکوتِ شام غریباں ہے دیکھیئے کیا ہو

کہاں گئے وہ نشیب و فراز، یاس و اُمید
سپاٹ سا دل ویراں ہے دیکھیئے کیا ہو

جنونِ عشق حدِ لاشعور تک پہنچا
شعور سر بہ گریباں ہے دیکھیئے کیا ہو

ابھی تو اس کا نشاں تک ملا نہیں طالب
تلاشِ عظمتِ انساں ہے دیکھیئے کیا ہو

نئی دہلی ۴ جون ۷۳ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

خود دار کی مجبوری راضی بہ رضا آئی
ہنگامِ دعا اُس کو یاد اپنی انا آئی!

آفات کی چکی میں پستا ہی رہا انساں
لیکن نہ خداؤں کو کچھ اس پہ دیا آئی

اے وحشتِ دل تجھ کو کیا اس سے ہوا حاصل
اک عاشقِ صادق کو دیوانہ بنا آئی

پھولوں کا تو کہنا کیا، کانٹے بھی سلگتے ہیں
زخموں کے گلستاں سے وہ گرم ہوا آئی

مدھم سی لکیریں ہیں، مبہم سے اشارے ہیں
ذہنوں کے دریچوں سے خنسر دا کی ہوا آئی

ذہن اور تصور نے احسان کیا ہم پہ
یاد اُن کا خیال آیا، یاد اپنی خطا آئی

ماضی کا لباسِ نو بے کار ہوا ثابت
کام آئی تو اپنی ہی دیرینہ قبا آئی

احساس کی سازش تھی، یا ذہن کا دھوکا تھا
نغموں کے ترنم میں چیخوں کی صدا آئی

شاید یہ غمِ دل کی لذت کا تقاضا تھا
رہ رہ کے مجھے طالبؔ یاد اپنی نوا آئی!

نئی دہلی۔ ۲۹ر اگست [illegible]ء

(آجکل دہلی)

ظلمت کا فسوں ٹوٹا، ہنگامِ سحر آیا
بیدار ہوئی قسمت ہنگامِ سحر آیا

جذباتِ محبت نے کیا چشمِ بصیرت ادی
جو ذہن سے مخفی تھا، وہ دل کو نظر آیا

یاروں کے تبسم میں اپنی ہی خوشی دیکھی
غیروں کی مصیبت میں غم اپنا نظر آیا

غم خوار کی پرسش پر اچھا تھا کہ چپ رہتے
جب ہم نے زباں کھولی، دل درد سے بھر آیا

احباب مجھے طالبؔ رہتے ہیں خفا مجھ سے
شاید کہ نظر اُن کو کچھ مجھ میں ہنر آیا

نئی دہلی ۲۵ر اگست [illegible]ء

([illegible] نئی تعلیم دہلی)

○

بیزارِ زندگی سے دلِ مضمحل نہیں — شاید بقدرِ ظرف ابھی دردِ دل نہیں

اپنا تو اُس نے ساتھ نبھایا ہے عمر بھر — کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ غم مستقل نہیں

دیوانۂ مفاد ہے بیگانۂ خلوص — وہ اہلِ عقل و ہوش سہی اہلِ دل نہیں

شعلے کہاں سے آئیں گے کیسے کھلیں گے پھول — زخموں کی آگ دل میں اگر مستقل نہیں

اب وہ ہماری بات کو سمجھیں گے کس طرح — جن کا دماغ تو ہے مگر جن کا دل نہیں

کیا خوب انہماک ہے محوِ خیال کا
طالبؔ خدا کی ذات بھی اس میں مخل نہیں

نئی دہلی ۔ ۲۰ ستمبر ۶۷ء

ہر گدا پارسا نہیں ہوتا — ہر پرندہ ہما نہیں ہوتا

آدمی ہی سے بھول ہوتی ہے — آدمی دیوتا نہیں ہوتا

تجھ سے ہوتا ہوں بارہا ناراض — دل سے لیکن خفا نہیں ہوتا

دل ہی بنتا ہے راہبر اپنا — جب کوئی رہنما نہیں ہوتا

مجھ سے اُن کا کہا کہاں ہوگا — مجھ سے اپنا کہا نہیں ہوتا

عزم راسخ کبھی نہیں بنتا — شوق جو دیرپا نہیں ہوتا

ہو ضرورت نہ جس کو بندوں کی — کوئی ایسا خدا نہیں ہوتا

اُس کا کوئی خدا نہیں بنتا — جس کا کوئی خدا نہیں ہوتا

عکس اپنے ہی دل کا ہے طالبؔ — ورنہ اچھا بُرا نہیں ہوتا

نئی دہلی ۲۱ ستمبر ۶۷ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

بات دل کی کہیں تو بات بنے
بات دل سے سنیں تو بات بنے

ہو کے مجبور غم سہا تو کیا
غم خوشی سے سہیں تو بات بنے

اشک آنکھوں سے بہہ رہے ہیں عبث
اشک دل سے بہیں تو بات بنے

بغض و نفرت کو تیاگ کر طالب
پریم پیالہ پئیں تو بات بنے

نئی دہلی ۔ ۲۵ ، اکتوبر ۱۹۷۸ء

رشک جنت فضائے راز و نیاز
جذبۂ عشق اتیری عمر دراز

کون محمود اور کون ایاز
اب نہ بندہ کوئی نہ بندہ نواز

یہ مساوات کا زمانہ ہے
چڑھ گیا سب پہ رنگ حرص و آز

سر میں سودائے دولت قاروں
دل میں اندیشہ ہائے دور دراز

ایک ہی درد ایک ہی درماں
ایک ہی ساز ایک ہی آواز

کیا خلا میں ہے دیکھنے کے لئے
لے اڑی مجھ کو حسرت پرواز

جانتا ہوں کہ وہ نہ آئے گا
پھر بھی کہتا ہے دل کہ دے آواز

ذوق گفتار کے سوا طالب
لب کشائی کا اور کیا ہے جواز

نئی دہلی ۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۵ء
(رہنمائے تعلیم نئی دہلی)

○

پھولوں کی جستجو تھی ملے خار بھی نہیں — اپنے لیے تو لذتِ آزار بھی نہیں

اب کیا کریں گے ڈھونڈ کے ذوقِ جمال کو — چشمِ طلب کو حسرتِ دیدار بھی نہیں

ہوتی تو اس کو پہچانتے اہلِ جنوں ضرور — صحرائے عقل و ہوش میں دیوار بھی نہیں

طالب کو یوں نہ چشمِ حقارت سے دیکھئے

وہ پارسا نہیں تو گنہگار بھی نہیں

نئی دہلی ۲ ر فروری [illegible] — (رہنمائے تعلیم نئی دہلی)

رعنائیِ خیال نے بہکا دیا مجھے — اک اجنبی پہ آپ کا دھوکا ہوا مجھے

ہر اک نیا سوال تھا گہوارۂ فریب — ہر اک نیا خیال بہلاوا لگا مجھے

مجبوریوں نے لوٹ لیا لطفِ زندگی — دیتا رہا تسلیاں میرا خدا مجھے

اچھا ہوا کہ ٹوٹ گیا دل کا آئینہ

کمبخت بات بات پہ تھا ٹوکتا مجھے

طالب برا ہو چشمِ حقیقت شناس کا

لگتا ہے اجنبی سا ہر اک آشنا مجھے

نئی دہلی ۲۳ ر مارچ [illegible] — (رہنمائے تعلیم دہلی)

آدمی ہلپتا رہا وقت کے گہواروں میں — زندگی ڈھلتی رہی فکر کے شہکاروں میں

آئی تہذیب خداؤں کا سہارا لے کر — تھی عقیدت بھی روایت کے طرفداروں میں

کفر کی آگ کو ایمان بجھاتا بھی رہا — اور شامل بھی رہا شر کے پرستاروں میں

لگ گئی کس کی نظر ویش کی یکجہتی کو — خوں کی گنگا بھی لگی بہنے کئی دھاروں میں

خود فریبی ہے کہ اغیار کی سازش طالب

دیش دشمن بھی ہیں اب قوم کے معماروں میں

گلزاروں سے کہاں پھول ہیں گلزاروں میں — جو نہیں ماہ میں وہ بات ہے مہ پاروں میں

ہے مناسب کہ رہے رحمتِ باری محتاط — بے گنہ لوگ بھی بیٹھے ہیں گنہگاروں میں

جانے کس رشک مسیحا کی ہے آمد آمد — جو مسیحا بھی نظر آتے ہیں بیماروں میں

مفت بکنے کو ہیں بیتاب ہزاروں یوسف — ہو نہ ہو کوئی زلیخا ہے خریداروں میں

تھے مرے قتل کی سازش کے محرک جو لوگ

سب سے آگے ہیں وہی میرے عزاداروں میں

قابلِ رحم ہے اُن لوگوں کی حالت طالب

جو کہ ناداروں میں ہیں اور نہ زرداروں میں!

نئی دہلی ۔ ۱۲، اپریل [illegible] — در رہنمائے تعلیم دہلی

○

کونپل نئے خیال کی پھوٹی دماغ سے
آنے لگے پیام بہاروں کے باغ سے

ماضی سے حال روشنی لیتا رہا مدام
جلتا رہا چراغ ہمیشہ چراغ سے

حُسنِ بیاں کہیں سے، کہیں سے لیا خیال
گُلہائے رنگ رنگ لئے باغ باغ سے

اوروں کے فکر و فن سے ہوئے ہم بھی فیضیاب
تُم بھی دیئے جلاؤ ہمارے چراغ سے

جادو جگا رہا ہے تصوّر کا مُو قلم
قوسِ قزح کے رنگ لئے باغ باغ سے

مہکے ہوئے گلاب ہیں جلتے ہوئے کنول
جلوے چھلک پڑے ہیں کسی کے ایاغ سے

ہے نُدرتِ خیال تخیل کی آبرو
منسوب کیوں نہ ہو یہ کسی خوش دماغ سے

شاید مہِ خیال کا نزدیک ہے طلوع
رخشاں فضائے تار ہیں ہیں شب چراغ سے

طالب اسی کے نور سے روشن ہوا ہے دل
ہم نے دیئے کا کام لیا ہے دماغ سے

نئی دہلی - ۱۵ر جولائی ۱۹۷۵ء (رہنمائے تعلیم نئی دہلی)

پالے ہوئے خزاں کے بہاروں سے ڈر گئے
نغمے خوشی کے اُن کو پریشان کر گئے

لالہ نے اُن کو لاکھ دکھائے جگر کے داغ
لیکن وہ خار و خس ہی سے لے کر اثر گئے

بے چین شورشوں کو سکوں کی ہوئی تلاش
طوفان پُوچھتے ہیں کنارے کدھر گئے؟

طالب دماغِ یار ٹھکانے پہ آ گیا؟
بگڑے ہوئے مزاج بھی آخر سدھر گئے؟

نئی دہلی - ۲ر اکتوبر ۷۵ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

O

نہ فقط درد گیا، درد کا مارا بھی گیا — غم آفاق کا یہ راج دُلارا بھی گیا

دُکھ تو یہ ہے کہ غم یار کا یارا بھی گیا — شمع محفل بھی بُجھی، صبح کا تارا بھی گیا

لو۔ دلِ زار سے اَب اُس کی اَنا بھی چل دی — بے سہاروں کا یہ تنکے کا سہارا بھی گیا

ڈوبتے تاروں کو دیکھا تو یہ دل نے پُوچھا — ڈوبنے والا کوئی تم سے اُبھارا بھی گیا؟

طبعِ مواج کی دریا سی روانی بھی گئی — بحرِ افکار کا ناپید کنارا بھی گیا

وہ نہ بولا یہ سمجھ کر کہ کوئی اور ہے وہ
نام طالب کا کئی بار پکارا بھی گیا

نئی دہلی ۱۴ر اکتوبر ۵۷ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

دل کی کلی نہ کھل سکی، جس سے وہ ہے بہار کیا — من کو نہ شانت کر سکا جو وہ ہے غم گسار کیا

وقت کی بات پہ نہ جا، وقت کا اعتبار کیا — سیلِ بلا سے خود نپٹ، غیر پہ انحصار کیا

میرے ہی دل کے راز کو مجھ سے چھپا کے رکھ لیا — ایسے ہی اہلِ راز کو کہتے ہیں رازدار کیا

عہدِ بہار میں خزاں آئی تو کیا نہ جائے گی — زیست ہے بے ثبات تو موت ہے پائیدار کیا

خون نہ کیا ضمیر کا میں نے کسی کے واسطے — مجھ سے خراب شخص کو، یاد کریں گے یار کیا

غم کی نوازشات نے طالبِ غم بنا دیا
دل کے معاملات میں عقل کو اختیار کیا

نئی دہلی ۔ ۱۲ر نومبر ۶۶ء — (رہنمائے تعلیم دہلی)

○

فکر و فن کو بے نیازی کی ادا دیتے رہو
جو نہ سُن سکتے ہُوں اُن کو بھی صدا دیتے رہو

بڑھ نہیں سکتے تو اور وں کا نہ روکو راستہ
بڑھنے والوں کو خوشی سے راستہ دیتے رہو

تھک نہ جائے فرض کا احساس راہ زیست میں
ساتھ اُس کا اے دلِ بے مدّعا دیتے رہو

ہم زمیں والوں کی بھی شاید وہ سُن لیں ایک دن
آسمانوں کو خُدا کا واسطہ دیتے رہو

گھٹ کے مرجائے نہ طالب دل ہی میں آوازِ دل
دامنِ اشعار کی اس کو ہوا دیتے رہو

نئی دہلی۔ ۳۰ رجنوری ۶۷ء (رہنمائے تعلیم دہلی)

ا چھوتا سا خیالِ خام لے کر
انوکھا سا غمِ ایّام لے کر

تہِ داماں شکستہ جام لے کر
دلِ خو کردہ آلام لے کر

چلے ہیں رہ روانِ راہِ اُلفت
کسی کے نام کچھ پیغام لے کر

مرا انجام ہے پھولوں کا انجام
اُٹھا کر پھینک دیں گے کام لے کر

نہ آیا عمر بھر جینا نہ آیا
جئیں جینے کا کیوں الزام لے کر

مچل اُٹھا مرا ذوقِ اسیری
شکاری آگیا جب دام لے کر

سبھی روتے ہیں اپنا اپنا رونا
مگر طالب کسی کا نام لے کر

نئی دہلی۔ ۱۴ر مارچ ۶۸ء

○

غم سلگتے رہے مواغ جلتے رہے
شمع روتی رہی، دل پگھلتے رہے

پی کے خونِ جگر زخم پلتے رہے
ہم انا کے نوالے نگلتے رہے

بجلیاں لالہ و گل پہ گرتی رہیں
چاند تاروں کے ارماں نکلتے رہے

بات مہر و مروت کی چلتی رہی
ذہن نفرت کا لاوا اُگلتے رہے

درد کو اشک بن کر نہ بہنے دیا
من میں دکھ کے سمندر اُبلتے رہے

اپنی مجبوریاں منہ چڑاتی رہیں
درد و غم دل کے پہلو میں پلتے رہے

لب پہ آیا نہ حرفِ تمنّا کبھی
دل کے ارمان دل میں مچلتے رہے

شدّتِ درد دل کی زباں بن گئی
دل کے جذبات چیخوں میں ڈھلتے رہے

شانتی کا پجاری نہ کچھ کر سکا
من کے مندر میں بندر اُچھلتے رہے

کوئی آتا رہا کوئی جاتا رہا
ڈوب کر چاند سورج نکلتے رہے

ہم کو لطفِ تغیّر تو ملتا رہا
ہم نہ بدلے تو کیا وہ بدلتے رہے

جی نہ ہارا کبھی دل نہ چھوڑا کبھی!
عرش سے گر کے بھی ہم سنبھلتے رہے

ڈگمگائی نہ طالب کی سادہ دلی
عقل و دانش کے پاؤں پھسلتے رہے

نئی دہلی - ۲۴ر مارچ ۱۹۷۶ء

بے کیف مسرت بھی مصیبت سی لگے ہے
اے دوست مجھے غم کی ضرورت سی لگے ہے

روداد محبت کی کسی کو نہ سناؤ
کچھ لوگ ہیں جن کو یہ شکایت سی لگے ہے

دم توڑتی قدروں کو بچانے کی اُچھل کود
فطرت کے اصولوں سے بغاوت سی لگے ہے

دُنیائے تماشا تو بدلتی ہے کئی رنگ
گہہ خواب لگے گہہ حقیقت سی لگے ہے

احساس کا دھوکا ہے جذبات کا جادو
اپنوں کی عداوت بھی محبت سی لگے ہے

بے ربط خیالوں سے شگوفوں کی لطافت
مجبور غریبوں کی ذہانت سی لگے ہے

طالب کو شرافت پہ بڑا ناز تھا لیکن
اب اس کی شرافت بھی حماقت سی لگے ہے

نئی دہلی ۱۳؍ستمبر ۱۹۷۶ء (دورِ نو لکھنؤ)

غولِ رہ نے خضرِ رہ بن کر ہمیں گمرہ کیا
رہنمائے تیز رَو کو راہزن سمجھے تھے ہم

ہم ببولوں کو سمجھ بیٹھے تھے پھولوں کا جواب
خارِ رہ کو ہمسفر ہمدردِ دامن سمجھے تھے ہم

خون دینے کے لئے آیا نہ اُن میں سے کوئی
قیس سمجھے تھے کسی کو کوہکن سمجھے تھے ہم

تھی وہ طالب اپنے ہی احباب کی نشتر زنی
طعنۂ اغیار کی جس کو چبھن سمجھے تھے ہم

نئی دہلی ۲۷؍جون ۱۹۷۶ء

غموں کے کھیت میں پیدا کبھی خوشی نہ ہوئی
ستم ظریفیٔ فطرت سے دل لگی نہ ہوئی

ہزار ضبط کیا، لب سیئے پئے آنسو
غمِ حیات میں لیکن کوئی کمی نہ ہوئی

دل و دماغ کو تسکین تیری باتوں سے
کبھی کبھی تو ہوئی، اور کبھی کبھی نہ ہوئی

ہے اپنی اپنی طبیعت ہے اپنا اپنا ظرف
وہ دوست بن نہ سکے، ہم سے دشمنی نہ ہوئی

کسی بھی طرح سے نہ پایا حیات کو دلکش
یہ زندگی تو کسی طور زندگی نہ ہوئی

خیال مرنے کا آیا تو بارہا لیکن
خدا کے حکم سے توفیق خودکشی نہ ہوئی

ہے کیا کلام کہ طالبؔ رہے بہت اچھے
بروں میں رہ کے بھی نیت کبھی بری نہ ہوئی

نئی دہلی ١١-٦-١٩٧٦

ہنر ہو کسی کا کہ ہو عیب اپنا
جو اہلِ نظر ہیں وہ کم دیکھتے ہیں

حقیقت کے آئینہ میں اپنی صورت
نہ تم دیکھتے ہو، نہ ہم دیکھتے ہیں

رفاقت کو جو ناپتے ہیں غرض سے
وہ اوصافِ یاراں کے کم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا کسی نے نہ دیکھے گا کوئی
جن آنکھوں سے طالبؔ کو ہم دیکھتے ہیں

نئی دہلی - ٢٣ جولائی ١٩٧٦ء

○

ہُوا وہ جو نہ تھا وہم و گماں میں — بہارِ بے خزاں آئی خزاں میں
بہا دی ہم نے زرداروں کی سطوت — غمِ جمہور کے سیلِ رواں میں
وہ کیوں اوروں پہ پتھر پھینکتے ہیں — جو خود رہتے ہیں شیشے کے مکاں میں
مزا جب ہے محبت کی کہانی — کہی جائے محبت کی زباں میں
کوئی مانے نہ مانے ہم کہیں گے — مزا کہنے کا ہے اُردو زباں میں
حیاتِ چند روزہ کا تسلسل — کہاں ممکن حیاتِ جاوداں میں

خدا رکھے ہمارا ذکر اب کیا
نمایاں ہے "حدیثِ دیگراں" میں

نئی دہلی۔ ۱۶ دسمبر ۷۶ء

زندگی کا ہر اک لمحہ ہے قیمتی، اس کو جانے نہ دو رائیگاں دوستو
اس کو بخشش خدا کی تصوّر کرو، اس کو سمجھو نہ بارِ گراں دوستو
سیرِ دگل گشتِ گلشن ہی کافی نہیں، خونِ دل مانگتی ہے وطن کی زمیں
فرض ہے تم پہ اس کی حفاظت کرو، دلنشیں ہے باغ تم باغباں دوستو
ساری دُنیا سے اچھا ہمارا وطن، اس کی ہے دین تہذیبِ گنگ و جمن
اس کے ذرّوں میں تاروں کا ہے بانکپن، یہ زمیں ہے کہ ہے آسماں دوستو

نئی دہلی۔ ۱۵ / جنوری ۱۹۷۷ء

O

فکر و نظر کے ہم نے خزانے لٹائے ہیں
ذہنوں پہ پھر بھی وہمِ جہالت کے سائے ہیں

کندھوں پہ سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں ہم
کیوں لوگ اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے ہیں

آنے لگا ہے خوف بہاروں کے نام سے
وہ زخم ہم نے دورِ بہاراں میں کھائے ہیں

ہے اپنی سادگی کے سوا اور کون وہ
جس نے رہِ حیات میں کانٹے بچھائے ہیں

نیرنگیٔ حیات کی عشوہ گری تو دیکھ
رنگ اور بو کے ڈھیر کسی نے نچوڑائے ہیں

طالب نہ ان کو اشکِ ندامت کہے کوئی
حسرت نے یہ چراغ خوشی سے جلائے ہیں

نئی دہلی ۔ ۱۴ ؍ فروری ۱۹۷۷ء (ایسینک سماچار)

پیمانۂ حیات ہے غم سے بھر نہ جائے
دل کی شکست آنکھ سے گر کر بکھر نہ جائے

ناکامیوں کا زہر پلاتے رہو اسے
بے کارِ زندگی سے دلِ زار بھر نہ جائے

جینے کا جب مزا ہے کہ انساں ہو خود کفیل
کاسہ ضرورتوں کا لئے در بدر نہ جائے

وہ شعر کیا جو روح کو بالیدگی نہ دے
وہ حسن کیا جو آنکھ سے دل میں اتر نہ جائے

نئی دہلی ۔ ۲۱ ؍ اپریل ۱۹۷۷ء

نئی بات

وفا سے وفاؤں کی سوغات ہوگی　　نئی بات ہے ہاں، نئی بات ہوگی

وہ کہتے ہیں بے ابر برسات ہوگی　　ہوئی تو یقیناً کرامات ہوگی

گگن میں نئے چاند تارے سجیں گے　　دل آویز تصویرِ حالات ہوگی

سرِ شام ہونے لگے گا سویرا　　انوکھی نئے یگ کی پربھات ہوگی

خزاں لالہ و گل کو دے گی دلاسہ　　بہاروں کو جب مات پہ مات ہوگی

بھر آئیں گی اشکوں سے پھولوں کی آنکھیں　　بہارِ گزشتہ کی جب بات ہوگی

دیا آندھیوں میں جلانا ہے مشکل　　جلا پاؤ گے تو بڑی بات ہوگی

جو چھوڑے گی انساں کا دامن روایت　　گلوگیر قیدِ خیالات ہوگی

کہا کس نے تم سے میں آؤں گا تنہا　　مرے ساتھ یادوں کی بارات ہوگی

نجانے وہ طالب پہ کیوں مہرباں ہیں　　مدارات میں بھی کوئی گھات ہوگی

نئی دہلی - ۱۳ر اپریل ۷۷ء

کہاں جا رہے تھے کہاں آ گئے ہم　　سمجھ میں نہ آیا تو گھبرا گئے ہم

خیالوں کی ٹکر سے بچتے بچاتے　　خدا جانے کس کس سے ٹکرا گئے ہم

لگائے ہیں سب لوگ چہرے پہ چہرے　　یہ بہروپیوں میں کہاں آ گئے ہم

کہاں ساتھ دیتا ہے کوئی کسی کا　　بھری بزم سے اٹھ کے تنہا گئے ہم

سبھی دل لگانے کے ساماں بظاہر　　نجانے ہوا کیا کہ اکتا گئے ہم

نئی دہلی - ۵ر مئی ۱۹۷۷ء

○

سب پی رہے تھے مفت کی لیکن نہیں نے پی
اس کو انا کہوں کہ مقدر کی دل لگی

کچھ بن پڑے نہ اور تو مجبور کیا کرے
وہ جانتا ہے جرم ہے اقدامِ خودکشی

میں نے ہنسی ہنسی میں لٹا دی متاعِ زیست
رونے کا تھا مقام مگر آ گئی ہنسی

انسانیت کو ڈھونڈتے پھرتے ہو کس لئے
چھپ کر کہیں غریب نے کر لی ہے خودکشی

طالب نہ آرزو ہے نہ ہے جستجو مگر!
محسوس ہو رہی ہے کسی چیز کی کمی

نئی دہلی ۳ر جون ۱۹۷۸ء

گئی بہار کے پھولوں کو یاد کیا کرتے
ہمیں وہ بھول بھی جاتے تو کیا گِلہ کرتے

وفا سرشت میں ہوتی تو وہ وفا کرتے
دیا تھا درد تو اس درد کی دوا کرتے

گرا کے رسم و روایات کی فصیلوں کو
دل و دماغ کو مصروفِ ارتقا کرتے

ضیا کے نام پہ للکارتے اندھیروں کو
نظر فریب اُجالوں کا سامنا کرتے

کھنگالتے غمِ ایّام کے سمندر کو
تلاشِ چارۂ آزارِ لادوا کرتے

بہار اور خزاں کا نباہ ہو جاتا
اگر روا نہ شکایاتِ ناروا کرتے

کبھی گلوں کے ہیں طالب کبھی ہیں کانٹوں کے
یہ لوگ ایک کے ہو کر نہیں رہا کرتے

نئی دہلی ۔ ۵ر نومبر ۱۹۷۷ء

○

کیا پڑی ہے کسی کو آنے کی　　رہ کٹھن ہے غریب خانے کی

مر رہا ہوں فریب شے کوئی　　آرزو ہے فریب کھانے کی

ایک موہوم سی تمنا ہے　　زندگی کو حسیں بنانے کی

سطحِ فکر و نظر کو کر کے بلند　　آسماں کو قریب لانے کی

ذہنِ انساں فریب خوردہ ہے　　اس کو لت ہے فریب کھانے کی

ہم سبھی نے فریب کھایا ہے　　یہ حقیقت ہے اس فسانے کی

ہم نے بجلی سے سیکھ لی تکنیک　　آندھیوں میں دیا جلانے کی

من کا پنچھی اُداس ہے طالبؔ
یاد آئی ہے آشیانے کی

نئی دہلی - ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۷ء

○

ہم نے سمجھا تھا جسے غیر وہ نکلا اپنا　　کم نگاہی نے دکھایا ہے کرشمہ اپنا

کیا یقیں بھی ہے گماں ہی کے بدن کی خوشبو　　کیا حقیقت میں یقیں بھی ہے چھلاوا اپنا

جلوہ کون و مکاں آنکھ میں جچتا ہی نہیں　　جب سے دیکھا ہے خیالات نے جلوہ اپنا

کیا کہیں غیر کو اپنا ہیں سمجھے کیسے وہ لوگ　　جن کی آنکھوں کو نظر آیا نہ اپنا اپنا

طعنہ زن کیوں ہے یقیں وہم پہ طالبؔ شاید
اس نے درپن میں نہیں دیکھا سراپا اپنا

نئی دہلی - ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۷ء

○

قلم بن کے کاتب کا چلتے رہو — مقدر کا لکھا بدلتے رہو!
اُڑاتے رہو مشکلوں کی ہنسی — بڑھے جاؤ چاہے پھسلتے رہو
نگاہوں کو دے کر نئے زاویے — مسائل کی صورت بدلتے رہو
خوشی کو پلاتے رہو خونِ دل — غموں کا لہو پی کے پلتے رہو
یہی زندگی ہے یہی زندگی — پگھل جاؤ سانچوں میں ڈھلتے رہو
رکو گے تو مر جاؤ گے دوستو! — ہے جینا تو دن رات چلتے رہو

ہے طالب یہی کامیابی کا راز
گرو بھی تو اُٹھ کر سنبھلتے رہو

نئی دہلی ۔ ۱۴ر جنوری ۷۸ء

مانیں کیسے کہ دکھ درد سے اچھا ہو گا — جبرِ نو، جورِ گذشتہ کا مداوا ہو گا
کس کو معلوم تھا ہے نور کی تہ میں ظلمت — کس نے سوچا تھا کہ دل چاند کا میلا ہو گا
کون کہہ سکتا ہے کب تک نہ چھٹے گی ظلمت — کون کہہ سکتا ہے کب تک نہ سویرا ہو گا
اپنی فطرت کو بدل ڈالے گا انساں کیسے — ذائقہ نیم کا ہر حال میں کڑوا ہو گا

نئی دہلی ۔ ۹ر اپریل ۸۰ء

ان دغاباز اُجالوں سے اندھیرا اچھا — میں شبِ تار میں بے نور چلا جاؤں گا
میں نہیں موسیٰ مگر طالبِ دیدار تو ہوں — ایک دن میں بھی سرِ طور چلا جاؤں گا

نئی دہلی ۔ ۲۷ر اگست ۱۹۷۸ء

○

لہریں لیتے ہیں مرے من میں سمندر کتنے — دل کے آکاش میں ہیں نور کے ساگر کتنے

کتنے خورشید ہیں اور ماہِ منوّر کتنے — عقل حیران ہے امبر میں ہیں اختر کتنے

سنگریزوں نے چھپا رکھے ہیں گوہر کتنے — مُنہ چھپائے ہوئے ہیروں میں ہیں پتھر کتنے

رام نکلا نہ کوئی ان میں سے ارجن نکلا — مَن کے راجا نے رچائے ہیں سوئمبر کتنے

نہ گئی فطرتِ انساں سے خباثت نہ گئی — کتنے اوتار ہوئے، آئے پیمبر کتنے

بحرِ افکار کو پایاب نہ سمجھو طالب
اس میں غرقاب ہوئے تم سے شناور کتنے

نئی دہلی ۱۱ر ستمبر ۱۹۷۸ء

دل کی تسکیں کے لیے خونِ جگر کرتے ہیں — ہائے کیا لوگ ہیں جو عرضِ ہنر کرتے ہیں

زیست کی رات کو رو رو کے سحر کرتے ہیں — صبح ہوتی ہے تو پھر عزمِ سفر کرتے ہیں

بات تیکھی ہو تو دل چیر کے رکھ دیتی ہے — بول میٹھے ہوں تو پتھر میں بھی گھر کرتے ہیں

زندگی کرتے ہیں ہم فرض سمجھ کر طالب
پیار کرتے ہیں نہ ہم اُس سے حذر کرتے ہیں

نئی دہلی ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۸ء ("سفارت" دہلی)

اہلِ خرد کو چھوڑیے عشق کی بات کیجیے
دورِ جنوں نواز میں ہوش جنوں ہی ہوش ہے

نئی دہلی ۲۶ر ستمبر ۱۹۷۸ء

○

ہر ایک زخم ہرا ہے، ہر ایک غم تازہ
میں خود بھی کر نہ سکا اپنے دُکھ کا اندازہ

یہ سادہ لوحی بھی تو تُو نے ہی عطا کی ہے
بُھگت رہا ہُوں میں تیرے کیے کا خمیازہ

بکھر گیا ہُوں تو کیا مٹ گئی مری ہستی
نہیں وہ زیست بکھر جائے جس کا شیرازہ

نئے لباس میں آیا ہے پھر کے حسنِ خیال
طبیعتوں کے شگوفے ہوئے تر و تازہ!

اسی کے فیض سے آتی ہے اس میں رنگینی
خیال و فکر کو درکار غم کا ہے غازہ

کبھی نہ میں نے لگائی خیال پر بندش
کبھی نہ بند کیا ذہن و دل کا دروازہ

خدا کی شان کہ ظلمت ہے نور پر بھاری
فروغِ ماہ پہ کستا ہے بُوم آوازہ

پُرانی بات کو کیسے کہوں "نئی"، طالب
گُلِ فسردہ کو کیسے کہوں گُل تازہ

نئی دہلی ۔ ۱۸ ۔ اگست ۱۹۷۸ء

آیا نظر نہ کچھ بھی جہاں تک نظر گئی
منزل کی آرزو بھی نہ جانے کدھر گئی

آئی تھی میرے صحن میں پل بھر خوشی کی دُھوپ
دل سے نہ اس کی یاد مگر عمر بھر گئی

جُھوٹا خلوص بھی نہ عیادت کو آسکا
آخر انا غریب کی بے موت مر گئی

ہے شعر تو وہی جو دماغوں میں بس گیا
ہے بات تو وہی جو دِلوں میں اُتر گئی

طالب غمِ حیات کی شدّت کے باوجود
دل مانتا نہیں کہ دُعا بے اثر گئی

نئی دہلی ۲۶ نومبر ۱۹۷۸ء

○

اُوشا کی طرح شام سُہانی تو نہیں ہے — پیری کی سحر صبحِ جوانی تو نہیں ہے

ہستی ہے خیالوں کے تصادم سے عبارت — خوابوں سے بھی پریم کہانی تو نہیں ہے

تصویر کا دریا ہے یا دریا کی ہے تصویر — خوش رنگ سہی اسمیں روانی تو نہیں ہے

الفاظ دلاویز کی بھرمار میں طالب

جاں داریٔ افکار و معانی تو نہیں ہے

نئی دہلی۔ ۲۶ اکتوبر ۷۹ء

دل نادار دولت سے بھرا لگتا ہے — ڈال سوکھی ہے، مگر پات ہرا لگتا ہے

آئینہ دل کا مکدر ہو تو ہر عکس خراب — جو بُرا ہوتا ہے ہر شخص بُرا لگتا ہے

جس کو تم کہتے تھے ہے مٹی کا مادھو طالب

وہ تو سچ مچ کے خدا سے بھی بڑا لگتا ہے

نئی دہلی۔ ۲ فروری ۷۹ء

ایسا لگتا ہے کہ ذہن و دل میں کچھ بیمار ہے — ورنہ میں اور بھی چھڑاؤں لذتِ آزار سے

جن کو میں سمجھا تھا میں دیوارِ آہن وہ رفیق — جب پڑی مشکل تو نکلے ریت کی دیوار سے

میں تو دانستہ فریبِ زندگی کھاتا رہا — اور وہ سمجھے کہ میں ڈرتا ہوں اس مکار سے

اب نئے غنچے کھلیں گے فکر و فن کے باغ میں — ہم نے کچھ ماہر منگائے ہیں سمندر پار سے

پھول بھی شاید بدل ڈالیں اپنی دیرینہ روش — مجھ کو کانٹے تو بُلانے لگ گئے ہیں پیار سے

نئی دہلی ۱۸ مارچ ۷۹ء

O

اگلے وقتوں پہ طنز فرماتی — عہد حاضر کے زمزمے گاتی
بے نیازانہ برق کی صورت — اپنا آنچل ہوا میں لہراتی
گیسو لمحات کے بکھیرے ہوئے — ہے پری وقت کی اڑی جاتی
سایہ اس کے پیروں کا پڑتے ہی — دھوپ چھاؤں میں ہے بدل جاتی
وہ جو بیکنٹھ کے نواسی ہیں — ان کو دھرتی نظر نہیں آتی
آسماں سے زمین پر گر کر — کس کی صورت بگڑ نہیں جاتی
اتنی پستی سے اس بلندی تک — آہ بھی تو پہنچ نہیں پاتی
پھول کی پتیاں بکھرنے سے — اس کی خوشبو بکھر نہیں جاتی
کس مپرسی سے وہ بھی نالاں ہیں — خود نمائی جنھیں نہیں بھاتی

لوگ ہنستے ہیں غیر پر طالب
مجھ کو اپنوں پہ ہے ہنسی آتی

نئی دہلی - ۱۲، اپریل ۷۹ء

جتنے بھی سیاست کے حربے ہیں دو دھارے ہیں — یہ پیٹھ میں گھونپے ہیں وہ دل میں اتارے ہیں!
طوفاں نے ڈبوئے تھے طوفاں نے ابھارے ہیں — یہ لوگ تو جیسے ہی طوفاں کے سہارے ہیں
طوفان کی شورش سے وہ لوگ نہیں ڈرتے — گھر اپنا بناتے جو دریا کے کنارے ہیں
دریائے سیاست ہے آفات کا گہوارہ — موجوں میں مگرمچھ ہیں لہروں میں شرارے ہیں
کس کس کو دغا دیں گے یہ لوگ خدا جانے — کل تک جو تمہارے تھے اور آج ہمارے ہیں

جھوٹے ہیں مگر جامہ پہنے ہیں صداقت کا
ذرّے ہی سہی لیکن لگتے تو ستارے ہیں

لیلائے حکومت اب چلتی ہے کیسے دیکھیں
ستّو سال کے بوڑھے بھی ڈاڑھی کو سنوارے ہیں

سورج ہے نہ ہے چندا نہ ہو نہرہ ہے پرویں
سمجھتے ہیں ہمارے تو دُمدار ستارے ہیں

سنئیہ اور آہنسا کا کیا خوب نظارا ہے
پھولوں کے گلدستہ داماں سانپوں کے پٹارے میں

تقسیم جو کی تم نے واجب ہے مناسب ہے
دُکھ درد ہمارے ہیں، سُکھ چین تمہارے ہیں

سب اپنے مخالف کو کہتے ہیں بُرا طالب
لیکن یہ بُرے ہی تو اچھوں کے سہارے ہیں

نئی دہلی۔ ۱۹ ستمبر ۷۹ء

اگر چشم و دل بچ کے رہتے ہمارے
تو کیوں دیکھتے اُلٹے سیدھے نظارے

نچاتے رہے ہم کو بندر بنا کر
مداری تھے سچ مچ کے تیرے اشارے

ہمارے اصولوں کے اونچے محل کو
بہا لے گئے راج نیتی کے دھارے

نئی دوستی کے نئے عہد و پیماں
نئی اصطلاحیں، نئے استعارے

کئی بار من کے سمندر میں اُترے
کئی بار دُکھ سُکھ کے بوجھے اُتارے

حدودِ نظر تک تھا پانی ہی پانی
بہت دُور رہ کر کھڑے تھے کنارے

سمندر میں ایسے جزیرے بہت ہیں
جو زندہ ہیں تشنہ لبی کے سہارے

طلب دل میں پانی کی طالب لئے ہم
سرابوں کے پیچھے پھرے مارے مارے

نئی دہلی ۹ ستمبر ۷۹ء

○

پنچھی اُڑان بھر کے سُوئے آشیاں چلے — ہم پھاند کر حدودِ زمین و زماں چلے

دُنیائے رنگ و بُو کی سیاحت سے کیا ملا — بن کر بہار آئے تھے بن کر خزاں چلے

جانا تو ناگزیر ہے، جانے کا غم نہیں — غم ہے تو یہ کہ آگ سے ہو کر دھواں چلے

تقریب خود کُشی ہے یا انجامِ زندگی — غم ہائے روزگار کے مارے کہاں چلے

جب ہو گیا یقیں کہ ہے کاغذ کا میگھ ناتھ — مُردے بھی لے کے ہاتھ میں تیر و کماں چلے

یہ اور بات ہے کہ نمائش کئے بغیر — دے کر کسی کو آنکھ کسی کو زباں چلے

طالب جو کارواں کو دکھاتا رہا ہو راہ
کیوں گردِ راہ بن کے پسِ کارواں چلے

نئی دہلی۔ ۲۵؍ اکتوبر ۷۹ء

وہ پُوجتے ہیں خون بھی، پیتے ہیں جان بھی — وہ شانتی لاک بھی ہیں، وہ چنگیز خان بھی

دھرتی کی بات مان گیا آسمان بھی — اب چال باز لوگ ہی ہوں گے "مہان" بھی

کرتے تھے دال روٹی پہ ہنس ہنس کے جو گذر — اب ہیں بضد کہ چاہیئے "مُرغا" بھی "نان" بھی

گنگا میں ڈوب مرنے کو آئے ہیں، ڈر رہے — وہ گرم شیل ہی نہیں، ہیں بھاگیہ وان بھی

مندر کا کوش بھرتے ہیں جنتا کے مال سے — مندر کے کوش ہی ہیں سے دیتے ہیں دان بھی

مُنہ بھی کے لگ گیا ہے لہو اپنے دیش کا — پیٹ اُن کا بھر سکیں گے نہ دونوں جہان بھی

(مقطع ص ۸۵ پر دیکھیں)

○

میرا آئینہ مری شکل دکھاتا ہے مجھے
یہ وہ اپنا ہے جو بیگانہ بتاتا ہے مجھے

میرے احساسِ دوئی کو یہ ہوا دیتا ہے
میری ہستی کا یہ احساس کراتا ہے مجھے

کربِ احساس کراتا ہے خودی سے روشن
زعمِ ہستی کے جھروکے میں سجاتا ہے مجھے

قدر و قیمت کو بڑھانے کا بڑھاوا دے کر
بہرِ نیلام کہاں دل لئے جاتا ہے مجھے

سادگی میری اُسے دیتی ہے اذنِ گفتار
مجھ کو آتی ہے ہنسی جب وہ بناتا ہے مجھے

بھول جاتا ہوں سبھی جور و جفا کے قصے
جب کوئی گیت محبت کے سناتا ہے مجھے

کون سنتا ہے مرے دکھ کی کہانی طالبؔ
جس سے کہتا ہوں وہ اپنی ہی سناتا ہے مجھے

نئی دہلی - ۲۵ر جنوری ۱۹۸۰ء

خود سری اور خود پرستی کو انا سمجھا نہ کر
زندگی سے زندگی کے نام پر دھوکا نہ کر

ذہن و دل کی تندرستی زندگی کی جان ہے
زیست کو بیمار آنکھوں سے کبھی دیکھا نہ کر

چاند سے چہروں کے پیچھے جھانکنا اچھا نہیں
نشترِ تحقیق سے ہر چیز کو چھیدا نہ کر

میٹھی باتوں میں چھپی کڑوی حقیقت کو نہ چھ
بھولے پن کے لطفِ شیریں کا مزا کڑوا نہ کر

شاعری کے نام پر ماحول سے آنکھیں نہ مُوند
بند آنکھیں کر کے گرد و پیش کو دیکھا نہ کر

سرکشی جس پھول نے کی شاخ سے توڑا گیا
بھول کر بھی اپنا سر احباب سے اُونچا نہ کر

تابِ نظارا نہیں تو چڑھتے سورج کو نہ دیکھ
کم سے کم اِتنا تو کر ظُلمات کی پُوجا نہ کر

بھُول جا احسان اُس کے دورِ حاضر کے طبیب!
ہو مسیحا بھی اگر بیمار تو اچھا نہ کر

بیچ ہی ڈالی انا اپنی دلِ مجبور نے
بارہا ہم نے کہا "ایسا نہ کر ایسا نہ کر"

ہو سکے تو بھُول جا طالب غمِ ایّام کو!
زندگی کی دُھول سے دامانِ دل میلا نہ کر

نئی دہلی ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء

صفحہ ۱۸۳ سے

طالب نہ کچھ نشان قضا میں نہ ذکر خیر
تھی دیکھنے کی چیز تمھاری اُڑان بھی

○

شعورِ شعر کی سو نی ڈگر سے گزرے ہیں

جہانِ کیف کے تشنہ ذنگر سے گزرے ہیں

بہار ہی نہیں ہم نے خزاں بھی دیکھی ہے

بلند و پست سے خشک اور تر سے گزرے ہیں

تجھے خبر ہی نہیں تیرے چاہنے والے

خیال بن کے ترے بام و در سے گزرے ہیں

یہی بہت ہے کہ منزل پہ تو پہنچ پائے

نہ پوچھ یہ کہ کہاں سے کدھر سے گزرے ہیں

کسی خیال کے پرتو کا دل میں عکس لئے

نگار خانۂ فکر و نظر سے گزرے ہیں

ستم ظریفیٔ فطرت کی دیکھئے اُفتاد

خزاں نصیب بہاروں کے گھر سے گزرے ہیں

بقدرِ ظرف صداقت کے ہم ہوئے طالب

بقدرِ شوق رہِ پُر خطر سے گزرے ہیں

۲۷ر جون ۱۹۸۰ء "سفارت" نئی دہلی

ادم

قطعات

کوئی مجھ سے خوش نہیں، اور میں کسی سے خوش نہیں
ہے تعجب پھر بھی جینے کے لئے مرتا ہوں میں
مجھ کو جینا ہے، جئے جاتا ہوں، لیکن اس طرح
زندگی کے ساتھ گویا دل لگی کرتا ہوں میں

زندگی بھی کر رہی ہے، مجھ سے طالب دل لگی
جو دیا تھا میں نے اُس کو اُس نے واپس کر دیا
اُس نے ویسا ہی کیا جیسا کیا میں نے سلوک
مجھ کو شکوہ ہے نہ اُس کو مجھ سے ہے کوئی گلا

نئی دہلی، ۲۶/جون ۶۷ء

دھوکہ دیا دماغ نے جینے کے نام پر
سو سو فریب کھائے ہیں ایک ایک گام پر
ذوقِ طلب کی پیاس بجھائے نہ بجھ سکی
بجھتی بھی کیا کہ اُس کی تھی صہبائے خام پر

ساقی مجھے شراب کا وہ خاص جام دے
گرتی ہوئی اُمید کو جو بڑھ کے تھام لے
بجھتے ہوئے چراغ کو جو دے فروغِ نَو
جو زندگی کو بخش دے جلوے دوام کے ا

نئی دہلی۔ ۳۰، نومبر ۱۹۰۷ء

مجبُوری

جینے کی مجبُوری ہی سے تو جینا آ جاتا ہے
جانے پھر کیوں مجبوری کے نام سے جی گھبراتا ہے
مجبوری کے دم سے پیدا ہوتے ہیں عزم اور عمل
مجبوری سے انساں کو جینے کا سلیقہ آتا ہے
جینے کی مجبُوری اچھّی، مرنے کی آزادی سے
پستی چاہے غم کی ہو، بہتر ہے کہیں بربادی سے
ہستی کا ہر منظر رنگیں، ہر منظر کا رنگ جُدا
جلوؤں کے دریا بہتے ہیں صحرا، پربت وادی سے

اپنے من کی کہتے جاؤ، اپنے دل کی کرتے جاؤ
اپنے ہر اک دوش کا بوجھا سر اوروں کے دھرتے جاؤ
دُنیا کیا کہتی ہے چھوڑو، وہ تو کہتی ہی رہتی ہے
تم کو جینا ہے تو جی لو، ورنہ شوق سے مرتے جاؤ

چُپ چپ کیوں بیٹھے ہو بھائی، تم بھی اٹھو، ناچو گاؤ
دل سے غم کی پھانس نکالو، خوشیوں کی تیسر مناؤ
ہولی ہے اب تو خوش ہولو، ہو کا محرم تو رو لیں گے
جیسا وقت ہو ویسا کر لو، جیسا سمے ہو ویسا گاؤ

نئی دہلی - ۵ مارچ ۱۹۶۹ء

کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ میں جی رہا ہوں کیوں
ملبوسِ چاک چاک کو پھر سی رہا ہوں کیوں
کیوں بے مزہ سی زیست سے کرنے لگا ہوں پیار
بے کیفیٔ حیات کی مے پی رہا ہوں کیوں

لیکن میں جانتا ہوں کہ جیتا نہیں ہوں میں
تکتا ہوں راہ موت کی جینے کے نام پر
دل سے مٹا دیا ہے اک اک حرفِ آرزو
آئے نہ حرف تا کہ کسی نیک نام پر

مرنے کے خوف ہی نے دکھایا یہ معجزہ
بے کیف زندگی بھی گوارا ہوئی مجھے
جب یاس نے بھی اپنا سہارا ہٹا لیا
بحرِ فنا کی موج سہارا ہوئی مجھے

موجِ فنا کے دوش پہ ہو کر سوار میں
دریائے بے کراں کے کنارے پہنچ گیا
جادہ فریب دیتا رہا گام گام پر
رہرو تری صدا کے سہارے پہنچ گیا

نئی دہلی - ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

کتنا غلط خیال مرے دل میں آ گیا
مختار کو جو بندۂ بے کس بنا گیا
اپنی نگہ میں کر کے مجھے پست، تنگِ زیست
میرے وقارِ عزم کی مٹی اڑا گیا!

لازم ہے اس خیال کو دل سے نکال دوں
دستارِ کم ظرف کی سرِ رہ اچھال دوں
پھر سے دکھا کے آئینۂ اوجِ خیال کا
مایوسیوں کو آس کے سانچے میں ڈھال دوں

آواز دے کے عہدِ گزشتہ کو یوں بلا
پھر عزم مستقل ہو منازل کا رہنما
پھر جادۂ حیات مرے پیر چوم لے
پھر زندگی تلاش کرے میرے نقشِ پا!

آباد قلبِ زار ہیں روشن خیال ہوں
ذہنِ خزاں زدہ ہیں گل افشاں نہال ہوں
طالب بفیض کے نور سے پُر نور ہو دماغ
شکوہ اور شادمانی سے بسر ماہ و سال ہوں

نئی دہلی۔ ۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء

انسان یا شیطان

انسان کا جامہ پہنے دیکھا ہے کتنے شیطانوں کو
انسان کے بھیس میں پایا ہے ہم نے کتنے حیوانوں کو
تھے جوشِ جنوں سے دلوانے، یا کج فہمی کا چکر تھا
فرزانوں پر پھبتی کسنے ہم نے ہے سنا دیوانوں کو

شیطانی فطرت ہر اک اچھے کام سے نفرت کرتی ہے
تخریب پہ صدقے جاتی ہے، تعمیر کے نام سے ڈرتی ہے
یہ بادِ خزاں کی دلدادہ ہے، بادِ بہاراں کی دشمن
پھولوں سے بچ کر چلتی ہے، کانٹوں سے دامن بھرتی ہے

وہ پھول قضا کے ہاتھوں نے توڑا ہے شاخِ ہستی سے
جس کے جانے سے آس گئی منہ ڈھانپ کے من کی بستی سے

اب من کی سونی بستی میں یادوں کی جوگن رہتی ہے
جو گیت وفا کے گاتی ہے، دن رات ادائے مستی سے

بیتے لمحوں کی یادوں میں، مجبور گزارا کرتا ہے
جو وقت نہیں کاٹے کٹتا، یوں اُس سے کنارا کرتا ہے
بیتی باتوں کی رُپہلی راتوں اور سنہری شاموں کو
مجبورِ وفا طالبؔ راتوں کو چھپ کے پکارا کرتا ہے

نئی دہلی - ۵ر فروری ۱۹۷۰ء   ڈ سدھیر نمبر ۴ فرینڈز سیل

(بطرز مائش حضرت مفتوں شکوہ آبادی)   ڈیرہ دون)

سنجے گاندھی

(۲۳ر جون ۱۹۸۰ء کو ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہوئے)

بے تاب جو تھا کھلنے کے لئے افسوس وہ غنچہ کھل نہ سکا
یک دم ایسا طوفان اُٹھا کشتی کو ساحل مل نہ سکا

تنظیمِ گلستاں ہو نہ سکی، تزئینِ گلستاں کیا ہوتی
افسوس کہ سنجے گاندھی کو اس کام کی مہلت ہی نہ ملی

ہنگامِ سحر سورج ڈوبا، سب سے روشن تارا ٹوٹا!
بجلی کڑکی، کوندا لپکا، شعلہ بھڑکا اور ختم ہوا!

جو نور بکھیرا تھا اُس نے، ہے اُس سے فضا پُر نور ابھی
راہیں تو ہوئیں روشن اپنی، منزل ہے اگرچہ دور ابھی

اُمید کا دامن چھوڑو نہ طالبؔ، جو ہوگا، اچھا ہوگا
جو خون سے سینچا سنجے نے اُس پیڑ کا پھل میٹھا ہوگا

۱۰ر جولائی ۱۹۸۰ء   (طالبؔ چکوالی)

پنجابی نظمیں

ہند اور پاکستان کے دورِ حاضر کے سب سے مشہور اور مقبول شاعر کرنل فیض احمد فیض نے اپنی کتاب "شامِ شہر یاراں" میں اُردو کلام کے علاوہ ۱۰/۱۱ صفحے اپنے پنجابی کلام کے لئے بھی وقف کئے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی "برگِ زرد" میں اپنے پنجابی کلام کے چند صفحات شامل کرنا مناسب سمجھا۔ میری یہ چیزیں اُس وقت کے مشہور اور مقتدر ماہنامہ "سارنگ" (پنجابی بہ حروفِ اُردو) میں شائع ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجابی . . . زبان کو ساہتیہ (ادب) کی زبان تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ چیزیں (سائنٹ وغیرہ) بطورِ چیلنج لکھی گئیں تاکہ معترضین دیکھ سکیں کہ پنجابی زبان میں صرف "ہیر رانجھا" اور "سوہنی مہیوال" کے قصّوں کے علاوہ ادبی یا ساہتیک چیزیں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ انہی دنوں پروفیسر نندہ کی مشہور نظم "میلہ شالیمار دا" اور "لّی دا وواہ" شائع ہو کر مرکزِ توجہ ہوئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ آج پنجابی ساہتیہ ایک نخلِ گل فشاں، ایک شجرِ میوہ دار بن چکا ہے۔ اس کی سرافرازی اور دلعزیزی اُس کے پرانے مالیوں (جن کا نام اب تک کوئی نہیں جانتا) کے لئے وجہِ تسکین و تسلّی اور مایۂ افتخار و انبساط ہے۔

طالب چکوالی

(نظم)

وادی کرتوت

کلی باغ دے وِچ پئی وسدی سی — پئی وسدی ہسدی رسدی سی
انہدے حُسن خوشبو وِچ مست سی او — لگی چاٹ نہ پریم دے رس دی سی
خبر اوہنوں جہان دی ہونی سی کی — لگی تھس نہ عشق دے جھس دی سی
رہسی حُسن دا باغ ہمیش قائم — خبر ایہو اس "نمھوں بھڑس" دی سی

بُلبل باغ دے دنج سی مست بیٹھا — پھلیا پھلیا سی باغ جہان اُس نوں
بُجھ گجھ سی نا پند چند کوئی — مانو باغ سی اپنا مکان اُس نوں
نغمے دل دے دل وِچ گونجدے سن — دل دی پلی سی گنگی زبان اُس نوں
دِل دے راگ گتے دِل سی خوش ہوندا — ایہو زمی تے ایہو اسمان اُس نوں

آئی لشکدی مشکدی واسو ہنی — جنھوں ویکھیا اُنہوں غلام کیتا
نال خوشی دے کلی دی جھمن لگی — ڈاڈھے ناز دے نال سلام کیتا
کھِڑ کھِڑ ہس پئی سُن کے کلی سوہنی — خبر دے کن وِچ کی کلام کیتا
ہسی کلی تے ہس ہس پھُل بن گئی — وانے پرچا ایہہ باغ وِچ عام کیتا

خوشبو کلی تے ہاسے دی نال لے کے — نغمہ ہاسے دا گلے دا ہار کر کے
بُلبل والے درخت دے تھلوں لنگھی — وانگ دلبراں سولاں سنگار کر کے

"چمن جی ٹھہر جانا، ذرا گل سُننا" کہندا بُلبل ہزار پکار کر کے
پون گئی وگی کہنے ٹھہرنا سی ؟ کون ٹھہردا اے دل فگار کر کے

طالب چکوالی ——————— ماہنامہ "سارنگ" بابتہ اپریل ۱۹۳۳ء

پیری دی تصویر ویکھ کے

(ایک مشہور فرانسیسی پینٹر)

ایہ پینا پئی وجانی ایں کہ دِل نوں پئی بھُلانی ایں ؟
ایہ پینا پئی وجانی ایں کہ دل تے قہر ڈھانی ایں ؟
ایہ پینا پئی وجانی ایں کہ جادو پئی جگانی ایں ؟
جے پینا پئی وجانی ایں تے کس نوں پئی سُنانی ایں ؟

سُنانی پئی ایں کالے ناگ نوں پینا، نہیں منساں !
نہ میں منساں، نہیں اس گل دے وچ چالا، نہیں منساں !

غضب دا دیس کیتا ای غضب گیسو کھلارے نی
غضب نیناں دے کھچ کے تیر وچ سینے دے مارے نی
نہیں ایہ نین تے گیسو، ایہ جادو دے پٹارے نی
عجب جادو چلایا ای تڑپدے دل وچارے نی

نہ تڑپن دل تے کی ہووے، توں ہیں دل دار دُنیاں دی
چنگ پتھر دِلاں دی توں، توں ہیں سردار دُنیاں دی

تو ہیں فطرت دی دیوی یا کہ دیوی حسن دی ہیں توں!
میرے نیناں دا توں ہیں نور یا دل دی خوشی ہیں توں!
امیداں تو چانن ایں کہ میری زندگی ہیں توں!
کوئی پچھے تے کی دساں ذرا دسیں تے کی ہیں توں!

خدا دا واسطہ ای دس، نہ سن اتنا کھبایا کر
خموشی دی زبان توں حال دل دا کہہ سنایا کر

جے توں سچ مچ دا طالب ایں جے تیری اے طلب سچی
جے تیرا پریم اے پکا، جے تیری چاہ اے پکی
جے تیرے پریم دی ڈوری نہیں اے وانگ گھاہ کچی
تے پھر تینوں وی بس کیوں ایہہ چپ نظر آندی اے خاموشی

خموشی ایہہ نہیں، تصویر ہے بیبا مرے دل دی
نہیں تصویر ایہہ میری، جے ہے تاں ہے ترے دل دی

(ماہنامہ "سارنگ" بابتہ اگست ۱۹۳۳ء)

سانیٹ

(تصویر دیکھ کے)

کی پیاری پیاری صورت ہے
کیہا پیارا پیارا مکھڑا ہے
مانو ایہہ چن دا ٹکڑا ہے

سچ مچ ایہہ حسن دی مورت ہے
ہاں حسن دی مورت دل دی چاہ

دسّیں تاں دِل دی چاہ اسے کی
دل تیرا بے پرواہ اسے کی

نہ کردی واہ ایں توُں ناں آہ!
کس سوچ دے وِچ غرقاب ایں توَں!

دِسدا ہے بہت بے تاب ایں توُں
بے تاب ایں کیوں، مغموم ایں کیوں؟

تیرے دل دی کی حسرت ہے
تینوں بھی حسرت؟ حیرت ہے

ظالم نہ سہی، مظلوم ایں کیوں؟
اے سوہنڑی صورت والیئے دسّ؟

اے سوہنڑیاں اکھاں والیئے بول
اے سوہنڑی ایں دل دی گھنڈی کھول

اکھاں کس نال چالاکیاں نی؟
کس کیتیاں بے پرواہیاں نی؟

سالنامہ "سارنگ" بابتہ جنوری ۱۹۳۶ء

آج کل دے راکشس

آج اوہ کلیاں دے لکھاں توں ہوئے ٹولے، جیہڑے سن کدی شان بان والے
پئے سر لکان نوں بھرن در در ڈاہڈے اُچے عالی خاندان والے
ہتھ بدھے، بے دام غلام نیں آج، سو پُشتاں توں حکم چلان والے
ہائے خاک توں بھی ودھ کے خاک ہوئے، بھارت ورش والے ہندستان والے
خاک ہویاں نوں آ کے بنا بندے اوہ پتھر اہلیا بنان والے

راون اک سی تاں بھی توں درس دتا، ہن تے راوناں اگے حساب ہی نہیں
دیکھو ویکھی یتیماں دا مال کھاون، راکش کھانے ہن ماس کباب ہی نہیں
خون تک غریباں دا چوس لیون، راکش آج کل دے پیندے شراب ہی نہیں
راون دھرم پستک نوں تے مندا سی پر ہُن راوناں دی کوئی کتاب ہی نہیں
راما آ ویکھ تے انہاں توں کریں سدھا ہجھلتی آ دیں اوہے بانکی کمان والے

رام نومی دا پھیر تہوار آیا، توں بھی آ پھیر دیش اُپکار خاطر
جنم لیا سی اسے ہی دن تیں نیں، بھارت ورش دا کرن اُدھار خاطر
درشن تیرے دا تنگ اسی تنگ سارے ہاں، تیرے درشن تے تیرے دیدار خاطر
تینوں لوڑکی لے، اسی جانے ہاں پر توں ورشن دے پاپی سنسار خاطر
دیش بھارت دی شان ودھا آ کے، رگھونش کی شان ودھان والے

ماہنامہ "سارنگ" بابتہ جولائی ۱۹۴۶ء

بھگت سنگھ" (سرب ہند پنجابی کوی سبھا دہلی کے کوی دربار کے لئے)

بھگت سنگھ دی رُوح رو رو پُچھدی اے
ساڈے دیش دا ایہہ کی حال ہویا
دو ٹوٹے پنجاب دے کیوں ہوئے
دو ٹوٹے کیوں دیش بنگال ہویا
قتل عام جو ہویا پنجاب اندر
قتل عام اوہ بے مثال ہویا
مُنہ دھرتی دا، دل پنجابیاں دا
خُونو خُون ہویا لالو لال ہویا
سب کجھ ہویا تے کجھ خبریاں، کمن شنن نوں ہویا آزاد بھارت
نہیں دیش پنجاب برباد ہویا، سچ پچھو تے ہویا برباد بھارت
ایہہ اوہ آزادی تے نہیں بھائی
جس واسطے اسی قربان ہوئے
جس واسطے عیش آرام چھوڑے
گھر بار اساڈے ویران ہوئے
جس واسطے ہس ہس قید کٹی
چڑھے سولیاں تے بلیدان ہوئے
کنڈھے ستلج دے جنگل شہر ساڈی
دیہہ ساڑن دے چوری سامان ہوئے

جے کر ایہو آزادی ہے سچ مچ دی، اسی باز آئے اسی باز آئے
ملی سوہنڑی آزادی ہے ہتھیاں نوں ڈہ گئے شیکرے ڈہ باز آئے

اسی کہندے ساں کدی او وقت آسی

دیش دا سبھ ہر اک آزاد ہوسی

نکا وڈا آزادی دا ساہ لیسی

نکا وڈا خوش باش، دل شاد ہوسی

ہوئی گی آزادی ایہہ ویر میرے

اک برباد ہویا، اک برباد ہوسی

اسی مناں گے دیش آزاد ہویا

جدوں ہر بے گھر آباد ہوسی

پر ہُن تے ہے آزادی دا ہور نقشہ، مطلب آزادی دا ہور ہویا
چور کالے بازار دے شیر ہوئے، رشوت والیاں دا زور شور ہویا

ہویا زور سفارشاں والیاں دا

کھدر پا کے مطلب ستھ لیندے

گاندھی جی دے نقلی مرید بن کے

دیش بھگتی دا سانگ اتار لیندے

حق دار دا حق ہڑپ کر دے

کھاندے پیندے نہ ہول ڈکار لیندے

پگڑی سرنہ جنہاں دے ہے ٹوپی

پگڑی اینہاں توں دی کئی ہزار لیندے

دیکھ دیکھ کے طالب حیران ہویا ڈاہڈی موج آزادی نے لائی ہوئی ہے
بھُکھے ہور بھکھے، موٹے ہور موٹے، رُت وردھن ودھان دی آئی ہوئی ہے

۲۰ اپریل ۱۹۴۹ء "ہندو" جالندھر

طالبؔ چکوالی
کے کلام سے متعلّق
مشاہیر کے
ارشاداتِ عالیہ
کا
اختصار
مرتبہ :— پی۔ پور

تعارف

نام :- ——— منوہر لال

ادبی نام : ——— طالب چکوالی

ذات :——— کپور (کشتری - باہری)

والد صاحب کا نام :——— لالہ بال مکند

تاریخ ولادت :——— ۱۳ ر مئی ۱۹۰۰ء

مقام ولادت :——— چکوال (ضلع جہلم) مغربی پاکستان

خاندان :- ——— ضلع جہلم کا مشہور و معروف زمیندار اور متمول کپور خاندان جس کے سربراہ لالہ ایشر داس کپور رئیس اعظم تھے جو اپنی شرافت، حلیمی، پرہیزگاری اور دان پُن کے لئے سارے علاقہ میں جانے جاتے تھے۔ طالب کے والدین بچپن ہی میں اُسے یتیم کر کے سورگ سُدھار گئے۔ پرورش اور تعلیم و تدریس دادا صاحب لالہ ایشر داس نے کمال محبت اور دریا دلی سے کی۔

تعلیم :- ——— میٹرک ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول چکوال سنہ ۱۹۱۷ء

بی۔اے ——— (انگریزی میں آنرس کے ساتھ) گورنمنٹ کالج لاہور سنہ ۱۹۲۱ء

ایل ایل بی :- ——— یونیورسٹی لا کالج لاہور سنہ ۱۹۲۳ء

تمام امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے اور متعدد انعامات

حاصل کئے۔ آل انڈیا یونٹی لیگ کے کل ہند مقابلہ میں بہترین نظم "اتحاد" کے لئے سونے کا تمغہ اور سندِ امتیاز ملے۔

استاد:۔ ذوقِ سلیم کے علاوہ ہر نئے پرانے معروف و غیر معروف شاعر سے استفادہ کیا۔

ذریعہ معاش:۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۶ء تک وکالت، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک پتھری کوئلہ کا ہول سیل بیوپار، ہیڈ آفس راولپنڈی، دیگر دفاتر پشاور، سیالکوٹ وغیرہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے ہجرت کر کے دہلی میں بہ حیثیت ریفیوجی آکر نارتھ لینڈ انڈسٹریز میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلق دسمبر ۱۹۷۹ء کے بعد منقطع ہو گیا۔ اور ریٹائرڈ لائف کا آغاز ہوا اور رام جانے کب اختتام پذیر ہو

تصانیف:۔ "انوارِ حقیقت" (۱۹۲۹ء) برگ سبز (۱۹۶۵ء) وغیرہ "برگِ زرد" کی اشاعت ۱۹۸۰ء میں متوقع

ادبی سرگرمیاں:۔ "بزمِ ادب" چکوال اور "ادبی سبھا" دہلی کے بانی اور کنوینر کی حیثیت سے شعر و ادب کی جی بھر کر بے غرض خدمت کی۔ ۱۹۲۰ء سے کلام متقدر اخبارات و رسائل میں شائع ہو رہا ہے۔ مشاعروں میں شرکت ہونا ابھی ترک نہیں کیا احباب سے ملاقات کے بعد شوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔

پتہ

منوہر نواس جے III ۳۲ لاجپت نگر۔ نئی دہلی ۲۴-۱۱۰۰

فون نمبر:۔ ۶۲۵۸۱۴

عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریۂ ہند

دوسرے مکروہات کے باعث دو چار روز پہلے تک کتاب (برگِ سبز) کا پڑھنے کا وقت ملنا مشکل تھا۔ بارے موقع مل گیا تو کتاب پڑھی۔ خوب ہے۔ بہت خوب۔ خدا کرے آپ کے قلم سے اُردو زبان کے سرمایہ میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔

نیازمند

دستخط ذاکر حسین ۱۱ ۸/ ۱۹۶۵

بابائے ادب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

قریباً ہر صنف میں اور متنوع موضوعوں پر آپ نے وقتاً فوقتاً جو کچھ فرمایا ہے اس کی امتیازی جگہ اور افادیت مسلّم ہے۔۔۔۔ ایک قسم کی داخلی خارجیت آپ کے کلام کی قابلِ قدر خصوصیت ہے۔ غزل ہو یا نظم قطعہ ہو یا مثنوی آپ کی خوش بیانی اور زبان دانی کا رنگ چوکھا ہے۔

(دستخط) کیفی غازی آباد ۵-۱۰-۱۹۵۵ء

حضرت پروفیسر تلوک چند محروم نئی دہلی

کہہ رہی ہے صاف آب و تابِ ان اشعار کی!
طبعِ طالب کم نہیں ہے ابرِ گوہر بار سے

نازشِ طبعِ شاعر کیوں نہ ہوں ایسے حسین
جب ہو خود شاعر مزین خوبیٔ کردار سے

قدرتِ حق سے عطا ان کو ہوئی ہے شاعری
فن نہیں سیکھا انہوں نے یہ کسی فنکار سے

یوں کھلا رکھے ہیں گلہائے مضامیں حسنِ طرح
چن کے لائے پھول کوئی تازہ تر گلزار سے

(برگ سبز تقریظ)

حضرت منور لکھنوی خلف ملک الشعراء حضرت آفق لکھنو

مہک اٹھا ہے جو بن کر گل گلزار ادب
یہ سخن سنج گرامی ہے پرستارِ ادب
گامزن جو ہے مطالب کی گذرگاہوں میں
ہے چمن زار معانی کے ہواخواہوں میں
نہر سی جس کے تخیل میں رواں ملتی ہے
جس کے جذبات میں تاثیر نہاں ملتی ہے
طبع موزوں کو فردوس نشاں پاتا ہوں
اس میں کوثر کی روانی کا سماں پاتا ہوں

(برگ سبز تعارف)

شاعر نکتہ سنج منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی صاحب

لباس شعر میں افکارِ عالی
بہم شانِ جمالی اور جلالی
ادائے خاص سے نکتہ سرائی
بہت مقبول اس کی خوشنوائی
لطافت کا چمن دیوان اس کا
پُر از رنگیں سخن دیوان اس کا
لگائے ہیں مضامیں کے وہ انبار
کہ رنگا رنگ ہے بازار اشعار

(از قطعہ تاریخ برگِ سبز)

سخنا سخن حضرت آبر احسنی گنوری صاحب مصنف اصلاح سخن وغیرہ

"برگ سبز"، تو بطور انکسار استعمال کیا ہے۔ حقیقتاً یہ خوانِ نعمت ہے جس میں ہر قسم کے لذیذ میوے سلیقے سے چنے ہوئے ہیں۔ کسی اہل دل کے لئے

یہ میوے ثمرہائے خلد بریں سے کم نہیں۔ جن سے مادیت کے کام و دہن تو لذت یاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ روح و ایماں اس کی لطافتوں سے جھوم اُٹھتے ہیں . . . . مبارک پیش ہے کہ آپ نے ان موتیوں کو قوم پر لٹا دیا۔ خدا کرے لوگ اس سے لطف اندوزی کے علاوہ سبق آموزی کا بھی کام لیں . . . جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اس کے مراحل کو باحسن الوجوہ طے کیا ہے۔ بعض جگہ تو آپ کی باریک بیں نظر وہاں پہنچی جہاں عام نگاہیں نہ پہنچ سکیں۔

گنور ضلع بدایوں ۹-۲-۶۶ء

جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی

یہ "برگ سبز" کسی درویش کا تحفہ نہیں بلکہ ایک خزینہ دار شعر و ادب کا عطیہ ہے۔ کہنے کو تو یہ صرف ایک برگ سبز ہے لیکن پُر بہار باغوں کی رنگینیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ آپ کے سے محسنین ادب جو نامساعد حالات اور ناموافق آب و ہوا میں بھی گیسوئے اُردو کی شانہ کشی میں مصروف ہیں خراج تحسین کے مستحق ہیں۔

۱۴/اگست ۱۹۶۵ء ادبستان لکھنؤ

ڈاکٹر پروفیسر منوہر سہائے انور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

مجھے آپ کے کلام کے مطالعہ سے بڑی مسرت حاصل ہوئی آپ نے خوب دادِ سخن پائی۔ آپ کے افکار کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ۳۱-۸-۶۵

ادیبِ زمانہ مولوی سیّد علی جوّاد زیدی صاحب ایم اے

یقیناً آپ اُن چند مخصوص افراد میں ہیں جو رموزِ فن پر عبور رکھتے ہیں اور جنہوں نے زبان اُردو کی نوک پلک سنواری ہے ۔ آپ حضرات کے سہارے اُردو نظم میں حالی اور آزاد کی روایت آگے بڑھی اور انہیں روایتوں کی گود میں نئی نسل کی نشو و نما ہوئی ۔ میں نے "برگِ سبز" کے ورق اُلٹنا شروع کئے تو معلوم ہوا کہ اپنی ادبی تاریخ کے ورق اُلٹ رہا ہوں ۔ تعریف کیا کروں بس اسی دعا پر ختم کرتا ہوں "اے وقتِ تو خوش کہ وقت ما خوش کردی" ۲۳-۱۱-۶۶ء

جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی ۔ صدر شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی

آپ کا مجموعہ "برگِ سبز" موصول ہوا ۔ چشم بہ دور ۔ خوب کہتے ہیں آپ ۔ ایک گھنٹہ بڑے عیش کا گزرا ۔ ۱۲-۷-۱۹۶۵ء

جناب ضیا فتح آبادی ایم اے صدر بزمِ "سیماب" دہلی

یہ کام وقت طلب ہے ۔ بہر حال ان کے کلام کا سرسری جائزہ لینے والا بھی اس بات کو پوری طرح جان لیتا ہے کہ وہ شعر برائے شعر کہنے کے قائل نہیں ہیں ان کے کلام میں عصری رجحانات اور وقتی تقاضوں کی پرچھائیاں بہت نمایاں ہیں ۔ انہوں نے خارجات اثرات و کیفیات کو شعری سانچے میں کچھ اس انداز سے ڈھالا ہے کہ اس میں خطیبانہ رنگ ابھرنے نہیں پایا .... ان کی

فطرت کی غمگینی اور سنجید گی شعر کے دریچوں سے جھانکتی ہے۔ (برگ سبز ریویو)

ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب چنڈی گڑھ

"برگِ سبز" کو اسکول، کالج، سوشل ایجوکیشنل سنٹر لائبریریوں کیلئے منظور کیا گیا۔

لالہ کاشی رام چاولہ صاحب سول لائنز لدھیانہ (۶۰ سے زائد کتابوں کے مصنف)

کتاب (برگِ سبز) کا نفسِ مضمون تو ایک نرالا گلدستہ ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ یا قدرت کا کوئی قابل ذکر منظر اچھوتا نہیں رہا۔

ممتاز الشعراء جناب خوشتر حیدر آبادی مصنف خمخانۂ خوشتر وغیرہ وغیرہ

پھر سے دیکر آفتابِ علمِ شرقی کو فروغ
علم کی دنیا میں پیدا کر دیا ہے انقلاب

فلسفہ، منطق، معانی حکمت و روحانیت
ہیں علوم اس کے ہر اک نکتے میں مضمر بے حساب

فقرہ فقرہ، مصرعہ مصرعہ لفظ لفظ اور حرف حرف
بے نظیر و بے مثال و انتخاب و لاجواب

چودھری ذکاء اللہ بسمل ایم اے ایل ایل بی سابق رکن ادارتِ شیرازہ اردو سول سیکریٹری گزٹ لاہور

طالبِ شیوا بیاں کا شعرِ تر
ہے مثیلِ مطلعِ نورِ سحر

اس سے روشن دیدۂ ارض و سما
اور اُس سے دین و ایماں کی نظر

دل رُبا ہر نکتہ، بندش دل پذیر
شعر شعر اس کا ہے معمورِ اثر

ترکشِ طالب میں ہیں ارجن کے تیر
یعنی ہے ہر شعر موزوں کا اگر

(تقریظ انوارِ حقیقت)

(ماہنامہ) آج کل دہلی بابتہ اکتوبر ۱۹۶۵ء

"برگِ سبز" جناب طالب چکوالی اردو کے بہت پرانے خوش گو شاعر ہیں۔ طالب صاحب ہر رنگ میں لکھتے ہیں چنانچہ کیفی دہلوی، تلوک چند محروم، منور لکھنوی اور امن صاحب نے ان کو دادِ سخن دی ہے۔ جب تقسیم ملک کے بعد انہیں دلی آنا پڑا تو ایک دلآویز شعر انہوں نے کہا۔

زیست کی مجبوریوں نے اور بھی پایا فروغ تھا غمِ جاناں ہی لیکن اب غمِ دوراں بھی ہے

دلی کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے رہے ہیں لیکن اب شاید اس لئے گوشہ نشین ہو گئے ہیں کہ ان محفلوں میں ہاؤ ہو زیادہ اور جوہر کم یاب ہے۔

(ماہنامہ) سریتا نئی دہلی بابتہ فروری ۱۹۶۶ء

"برگِ سبز" اردو کے کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر جناب طالب چکوالی کا مجموعۂ کلام ہے۔ سادگی اور خلوص ان کی بنیاد ہے زیرِ نظر مجموعہ کے مطالعہ سے جہاں طالب کی ذاتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے وہاں اس سے ان کے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ادبی تحریکوں کا بخوبی جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا ہو۔ طالب صاحب جدید شعراء کی طرح نیچریہ شاعری کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان کے ہاں غمِ دوراں بھی ہے اور غمِ جاناں بھی۔ ان کے ہاں قوتِ فکر بھی ہے قوتِ پرواز بھی۔

(ماہنامہ) پگڈنڈی امرتسر "برگِ سبز"

طالب چکوالی اگلے وقتوں کے بزرگ شاعر ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا ۱۹۲۳ء تا ۱۹۶۵ء

کا کلام شامل ہے۔۔۔۔۔۔ ان منظومات میں طالب نے اپنے دھیمے فکر اور سنجیدہ انداز بیان کا مظاہرہ کیا ہے اسلوب پرانی شعری روایات کے ساتھ ساتھ نئی بندشوں کا بھی حامل ہے۔۔۔ بعض نظموں میں انگریزی نظموں کے بحور کو سامنے رکھ کر نیا تجربہ پیش کیا گیا ہے۔

(ماہنامہ) راہ نمائے تعلیم دہلی۔ بابتہ جنوری ۱۹۶۷ء

"برگ سبز"۔ جناب چکوالی کا نام دنیائے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے مدت سے آپ کے مضامین نظم و نثر ادبی جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ "برگ سبز" میں اخلاق، مذہب، سیاست، قوم، وطن، سماج اور معاشرت سے متعلق مختلف موضوعات پر نظمیں اور بلند پایہ غزلیں شامل ہیں۔ "برگ سبز" آپ کی کہنہ مشقی، قادر الکلامی اور پختہ گوئی کی بیّن دلیل ہے۔ آپ کی طبع رواں کسی بھی صنف سخن میں بند نہیں۔

سہ "سرفراز" لکھنؤ ۹ دسمبر ۱۹۶۵ء

"برگ سبز" مجموعہ ہے جناب منوہر لال صاحب طالب چکوالی کی گرانقدر اور بلند پایہ غزلوں اور نظموں کا ـــ طالب چکوالی کا نام علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔۔۔ یقیناً اگر وہ اپنے کلام کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوتے تو آج ان کا شمار ہندوستان کے شعراء کی صف اول میں ہوتا مگر پھر بھی جن لوگوں نے آپ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ آپ کی بلند پایہ شعری صلاحیتوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ آپ کی شعری عظمت محسوس کرتے ہوئے آپ کے کلام کی دل سے قدر کرتے ہیں۔۔۔ طالب چکوالی صاحب کی نظمیں ہوں یا غزلیں ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ

کہتے ہیں کمال غور و فکر کے بعد کہتے ہیں اس لیئے آپ بات کو بڑے پُر اثر انداز میں پیش کرنے میں پوری کامیابی حاصل کرتے ہیں اور ایک کامیاب مفکر اور فلسفی کی طرح چیزوں کی گہرائیوں اور تہوں تک پہنچ جاتے ہیں اور بات میں بات پیدا کرنے میں خصوصی دست گاہ رکھتے ہیں آپ کے کلام میں سلاست فروانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ فلسفیانہ مطالب کو نظم کرنے میں بھی روانی پوری طرح برقرار رہتی ہے جو طالب صاحب کے کلام کی قابلِ قدر خوبی ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھیئے اور موصوف کی شاعرانہ صلاحیتوں کی داد دیجیئے۔

ذوقِ عمل ہے خوب مذاقِ سخن کیساتھ
اخلاق بھی تو چاہیئے علم اور فن کیساتھ

سود و زیاں کی فکر نہ سودائے خوب و زشت
ہے زندگی کا لطف تو دیوانہ پن کیساتھ

(روزانہ) تیج دہلی ۶ فروری ۱۹۶۶ء ریویو "برگ سبز"

جناب طالب چکوالی کا نام اور کلام اردو کے ادبی حلقوں میں غیر متعارف نہیں ہے ان کا کلام ملک کے ادبی جریدوں اور اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ "برگ سبز" میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۶۵ء تک کا نمائندہ کلام شامل ہے اس لیئے اس میں کافی رنگارنگی اور تنوع ہے ... "برگ سبز" سے طالب چکوالی کی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت جابجا ملتا ہے ..... طالب صاحب کے انداز بیان میں پختگی کافی پائی جاتی ہے۔ غزلیہ کلام میں انہوں نے روائتی غزل گوئی پر عمل پیرا ہونے کیساتھ ساتھ جو کچھ کہا ہے اس میں ان کی دل کی دھڑکنیں شامل ہیں..... تقسیم وطن کے متعلق طالب صاحب کے جذبات سے ان کے دل کی اندرونی چوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ بہر حال برگ سبز اردو کے

کے شعروادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

روزنامہ "ملاپ" ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء ریویو "برگ سبز"

جناب منوہر لال طالب چکوالی بی اے ایل ایل بی پنجاب کے اُن سربرآوردہ شعراء میں سے ہیں جن کو ہندوستان بھر میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جناب طالب چکوالی کی قومی وطنی منظریہ اور عشقیہ نظمیں برسوں ملک کے مقتدر رسائل اور جرائد میں شایع ہوتی رہی ہیں جنہیں سب نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ "برگ سبز" حضرت طالب چکوالی کے چالیس سالہ کلام کا ایسا حسین اور جمیل انتخاب ہے جس کی تازگی اور شادابی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ حضرت طالب چکوالی ایک شریف النفس انسان ہیں وہ صاحب دل صاحب نظر اور حسن شناس ہیں اس لئے ان کے جذبات و احساسات بلندی، پاکیزگی اور روشنی کی موجیں ہیں اس مجموعہ کی ہر نظم اور ہر غزل مستقل تاثر رکھتی ہے۔ میں صرف دو شعر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ فرماتے ہیں:۔

انہیں دیکھا تو پھر آنے لگے سپنے جوانی کے
حسین خوابوں کی دنیا جھومتی مستانہ وار آئی

محبت نے عطا کی زندگی کو اور رنگینی
بہار آتی تھی پہلے بھی مگر اب کے بہار آئی

(ہفتہ وار) "نوائے نفیس" دہلی ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء ریویو "برگ سبز"

کہنہ مشق و پختہ کار شاعر جناب طالب چکوالی کا مجموعہ نظم "برگ سبز" کے عنوان سے شایع ہوا ہے جو انتہائی دلکش اور جاذب نظر ہے اس میں دو صد سے زائد نظمیں غزلیں اور قطعات ہیں۔ کتاب صفائی بیان، بامحاورہ سلیس زبان اور بلند خیالات کی منہ بولتی تصویر ہے۔

سینک سماچار ۵ جون ۱۹۶۶ء ریویو "برگ سبز"

"برگ سبز" طالب چکوالی کی بصیرت افروز نظموں غزلوں سانیٹوں اور قطعات کا دلکش مجموعہ ہے۔ سادگی اور خلوص ان کی شاعری کی جان ہے انکی شاعری کے سوتے زندگی کی حقیقتوں سے پھوٹ کر نکلے ہیں۔ وہ فکر و نظر کو ایوانِ سخن کی رفعت سمجھ کر شعر کہتے ہیں خونِ جگر سے انہوں نے زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ جوشِ عمل سے امیدوں کی شمع جلا کر زندگی کی تاریکیوں کو عبور کرنے کے داعی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ طالب فطرت کے پرستار بھی ہیں اور رموزِ تصوّف کے کاشف بھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پرانی قدروں کے بھی قائل ہیں اور نئے تقاضوں کے معترف بھی۔ ان کا مجموعۂ کلام قدیم اور جدید اقدار کا آئینہ دار ہے۔

(انگریزی ہفتہ وار) سنہری نئی دہلی ریویو "برگ سبز"

طالب چکوالی اردو کے مشہور شاعر ہیں ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن ہوئی اور وہ ہجرت کر کے بھارت میں آ گئے۔ فطرتاً وہ روایت پسند ہیں لیکن تعلیم یافتہ اور ذکی الحس انسان ہونے کی وجہ سے وہ اپنے عہد کی پُر شور سماجی اور سیاسی لہروں سے الگ تھلگ نہ رہ سکے۔ اسی لئے ہم ان کے کلام میں جابجا روائتی علامتوں اور اسلوب کے ساتھ ساتھ عصری تحریکوں کے تاثر کی جھلک دیکھتے ہیں۔ ان کی بہت سی نظموں میں جن میں سے کچھ بلینک ورس (نظم معرا) ہیں، ان کے عہد کی سماجی اور سیاسی مشکلات کی عکاسی کی گئی ہے۔ طالب صاحب کے کلام میں معقول انسانیت اور حساس وطن پرستی کا زبردست ذائقہ موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تقسیم وطن کے المیہ نے ان کی حساس طبیعت پر گہرا صدمہ لگایا اور وہ اس کرب کو اپنے سینے میں رکھے ہوئے ہیں لیکن یہ بے پناہ غم بھی انہیں محض جذباتی بنا کر بہا لے جانے میں سپھل نہیں ہوا بلکہ اس نے ان کو اپنے عہد کو بہت گہرائی سے سمجھنے کی قدرت عطا کی۔ یہی چیز ان کی شاعری کو

ایک مخصوص زرخشانی سے مزین کرتی ہے۔

انگریزی روزنامہ **ٹریبیون** (انبالہ کنٹ) ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

"برگ سبز" ایک متنوع اور بہ افراط خالقِ شعر کے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۵ء تک کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اس کی ورق گردانی سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم ایک وسیع اور رنگین باغ میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ باغ ایک ایسے صاحبِ دل و دماغ کی تخلیق ہے جو ذاتی درد و کرب اور سماجی اور سیاسی مشکلات سے یکساں اثر لیتا ہے۔ طالب صاحب کی غیر متزلزل حب الوطنی اور خالص عشقِ فطرت ان کے کلام کا خاص رنگ ہے۔ ۴۷-۱۹۲۲ء میں برٹش راج کی غلامی کے خلاف نغمہ سرا ہیں حصولِ آزادی کے بعد وہ رشوت بے ایمانی اور خوش پروری جیسی معاشرتی لعنتوں سے نالاں ہیں۔ قدرتی مناظر کے ہر موڑ کے لئے ان کی بے لوث اور بے پایاں محبت مشہور انگریزی شاعر ورڈسورتھ (WORDS WORTH) جیسی لگتی ہے۔ دریائے انڈس (اٹک) کے چاندنی میں نہائے ہوئے کنارے کوہ ہمالیہ کی سر بفلک برف سے ڈھکی چوٹیاں، مختلف صحت افزا مقامات کے روح پرور مناظر ان کو وجد میں لانے کی ایک سی اہلیت رکھتے ہیں طالب کا مطمحِ نظر وسیع اور رنگارنگ ہے۔ وہ ہر ایک جذبہ اور احساس کی باسانی اور بخوبی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار زندگی کی چٹانوں سے تراشی ہوئی مورتیاں لگتے ہیں "برگ سبز" اپنے دھیمے، طرب انگیز لہجے کی بدولت قاری کو انتشار سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔

مقتدر ترقی پسند شاعر حضرت وامق جونپوری

"برگ سبز" اردو شاعری میں قادر الکلامی کا ایک ناقابل فراموش نمونہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فن کے قدیم ضوابط کو پوری طرح برتنے والے حضرات

طالب عصرِ حاضر کے مسائل کو موضوعِ سخن بنانے میں جدید نسل کے کسی شاعر سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہئیت کے معاملہ میں بھی روشن خیال ہیں پابند نظم کے علاوہ معریٰ نظم بھی کہتے ہیں اور دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں ..... حضرت طالب نے فرسودگی سے ہمیشہ گریز کیا۔ آج کی بات آج کہی۔ باوجود سن رسیدہ ہونے کے اپنے فن کو بڈھا نہیں ہونے دیا۔ آج بھی اُن کے افکار ویسے ہی جواں ہیں جیسے جوانی میں تھے ..... منظوم انتساب کے بعد اس مجموعہ میں پہلی نظم ٹالسٹائے" ہے انگریزی دورِ حکومت میں جس کا کہنا اور موجودہ زمانہ میں مہاتما گاندھی کو ٹالسٹائے کا خوشہ چیں تبلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ حضرتِ طالب علامہ اقبال کے بھی بڑے پرستار ہیں۔

"برگ سبز" حضرتِ طالب کے جذبۂ حب الوطنی۔ قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کی طلب اور ایک درد آشنا دل کی تڑپ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اور اس امر پر دال ہے کہ وہ ایک مستند اور معتبر شاعر ہیں۔

مطبوعہ :۔ جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی

تزئین و کتابت:- خورشید انور پھلواروی ریذیڈنس سودر کوسی ۳۲ بیگم پور دہلی ۱۵۳